اربابِ نثرِ اردو

یعنی

فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ

از

مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

پہلی بار صرف یہ کتاب دوسو پچاس کی تعداد میں شائع کی جارہی ہے۔
کیونکہ اس ایڈیشن کی کتابت زیادہ اچھی نہیں ہے اس لئے۔
دوسرا ایڈیشن جلد ہی عمدہ کتابت کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔

پہلی بار مارچ سنہ ۱۹۷۷ء

[redacted] [redacted]

(نعمانی پریس دہلی)
ناشر

اعتقاد

اعتقاد پبلشنگ ہاوس سوئیوالان نئی دہلی (۲)

(نوٹ) اس کتاب کی فہرست مضامین کتاب کے آخر میں دیکھیں۔

اُردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے

ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان اردو کی بنیاد اسوقت پڑی جب کہ مسلمان فاتحوں نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور آریہ ورتھ کے باشندوں سے میل جول قائم کیا۔ جوں جوں ان دونوں قوموں کے تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی مسلمانوں کی عربی فارسی اور ہندوستان کی آریائی زبانوں کے باہمی ملاپ سے ایک مخلوط زبان یعنی اردو عالم وجود میں آئی ابتدا ٔ سودا سلف لین دین اور دین و مذہب کی ضروریات کے الفاظ کا ذخیرہ فراہم ہوا اور یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے آج اردو نے دنیا کی دیگر السنہ کی طرح ایک ممتاز زبان کی حیثیت حاصل کر لی اور قوی امید ہے کہ اس دور تمدن میں اس کی ترقی و وسعت کے جو ذرایع پیدا ہو گئے ہیں ان سے یہ زبان حقیقی معنوں میں دنیا کی ایک مشہور اور وسیع زبان بن جائے گی۔

اگرچہ اردو کی بنیاد پڑے زمانہ دراز گزر چکا تھا لیکن اس میں علم و ادب کی کتابیں بالکل نہ تھیں اور وہ صرف تقریری زبان تھی مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے زمانہ میں شعر و شاعری تو شروع ہو گئی جہاں تک کتب نثر کا تعلق ہے اردو کا دامن نہایت ہی تنگ اور محدود تھا۔ ادبیات اردو کی اس زبردست تحریک سے قبل شمالی ہند میں

تو نثر کی کتابیں اس قدر کم تعداد میں لکھی گئیں کہ ان کا عدم و وجود برابر ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو نثر نویسی منظم و مربوط طور پر سب سے پہلے اسی کالج کی طرف سے عمل میں آئی۔ البتہ دکن کی سرزمین اس سے مستثنیٰ ہے اردو نظم کی طرح اردو نثر کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا ہے۔ اگرچہ اردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس وقت تک جو تحقیقات ہوئی ہے اور دکنی اہل قلم کی جو کتابیں دریافت ہوئی ہیں ان سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہے کہ شمالی ہند میں نثر نویسی کے شروع ہونے سے کئی سو سال قبل اس ملک میں اردو زبان کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی بلکہ اس میں نظم و نثر کے بار آور درخت بھی موجود تھے گو زمانۂ دراز تک اردو زبان کی ترقی کے باوجود عام خاص لوگ فارسی ہی لکھنا پسند کرتے تھے۔ اور اردو نثر لکھنے کو عیب سمجھتے یا بے کمالی سے تعبیر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ رنج کے خطوط، دواساز کے نسخے اور گھر کا حساب تک بھی فارسی میں لکھتے تھے مگر اہل دکن نے شمالی ہند کے برخلاف اردو کی طرف بہت جلد توجہ کی اور جو چیز شمالی ہند والوں نے صدیوں کے بعد شروع کی اس کو اہل دکن نے عرصہ دراز پہلے ترقی کے زینہ پر پہنچا دیا تھا۔

اردوئے قدیم[1] کی بعض تحقیقات نے حضرت شیخ عین الدین گنج العلمؒ متوفی ۷۹۵ھ کے دکنی رسائل کو جن کا ایک مجموعہ قلعہ سنٹ جارج کے کتب خانہ میں بتایا جاتا ہے اردو کی قدیم ترین مصنفات قرار دیا ہے

---

[1] اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ صاحب قادری

اس کے بعد کی دوسری کتاب حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی "معراج العاشقین" ہے آپ کا زمانۂ حیات ۷۲۱ھ تا ۸۲۵ھ ہے۔ آپ کے صاحبزادے کا بھی ایک نثر و نظم کا رسالہ ہمارے ایک دوست کو دستیاب ہوا ہے نیز آپ کے نواسے سید محمد عبد اللہ حسینی نامی نے حضرت غوث اعظم سید عبد القادر جیلانی رضؓ کے رسالہ "نشاط العشق" کو دکھنی میں ترجمہ کیا ہے یہ تمام کتابیں قدیم ترین دکھنی مصنفات ہیں اور ان میں سے تقریباً تمام مذہبی تعلیم و تبلیغ کی بدولت وجود میں آئی ہیں۔ ابتداءً ان ہی بزرگانِ دین نے عوام الناس کو جن کی عام بول چال کی زبان دکھنی یا قدیم اردو تھی، احکام و مسائل دین سکھانے اور تصوف و معرفت کے نکات بتانے کے لئے اس میں تصنیف و تالیف شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں سب سے پہلے مذہبی الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ اسکے بعد نویں اور دسویں صدی ہجری میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کا بھی بڑا حصہ مذہبی کتابوں ہی پر مشتمل ہے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاقؒ متوفی ۹۰۲ھ کی شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، اور گل باس، آپ کے فرزند حضرت شاہ برہان الدین جانمؒ کی مولفات، مولانا عبد اللہ کی احکام الصلوٰۃ (۱۰۲۳ھ) حضرت میراں یعقوبؒ کی شمائل الاتقیا (۱۰۶۷ھ) السید شاہ محمد قادری کے رسائل اور سید شاہ میر کا رسالہ اسرار توحید وغیرہ سب مذہبی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں جہاں تک موجودہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے چند ہی کتابیں مذہب سے ہٹ کر لکھی گئیں، اور ان میں بھی مذہب

کا عنصر غالب ہے۔ ایسی کتابوں میں ایک مولانا وجہی کی کتاب "سب رس"[۱] ہے جو ۱۶۳۵ء میں تالیف ہوئی اگرچہ یہ ایک قصہ ہے لیکن مصنف نے جابجا مذہبی امور سے بحث کی ہے اور صفحے کے صفحے اس موضوع کی نذر کر دیے ہیں غرض اس زمانہ قدیم میں جو کچھ لٹریچر پیدا ہوا وہ مذہب کی بدولت تھا اور اس ابتدائی دور میں اس کا دامن صرف مذہب تک محدود رہا۔ جب ذرا ترقی ہوئی تو قصص و حکایات کا ذخیرہ فراہم ہونے لگا اور اردو زبان اس صنف ادب سے آشنا ہوئی۔ ان کتابوں اور اس دور پر تفصیلی بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دکن میں اردو نثر نویسی اور ادب کے بعض شعبوں میں اچھی خاصی ترقی ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ ہر چیز آغاز کے وقت نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے یہ خصوصیت ہر زبان اور ادب میں پائی جاتی ہے۔ دکھنی الفاظ سے قطع نظر اس ابتدائی دور کی نثری پیداوار سادگی اور بے تکلفی کے زیور سے آراستہ تھی۔ چونکہ اس کی بنیاد عوام الناس کے افادہ پر رکھی گئی تھی اور ابتدائی مولفین کے پیش نظر فارسی کی ترقی یافتہ اور پر تکلف نثر کی بجائے قدمائے ایران کے سادہ و سلیس نثری کارنامے تھے اس لئے ابتدا ہی سے صفائی و سادگی کا خیال رکھا گیا۔ عبارت میں تصنع و تعقید نہیں۔ الفاظ کے ذریعہ زینت کلام مقصود نہیں جو کچھ بیان کرنا ہے حتی الوسع صاف صاف عبارت میں بیان کر دیا ہے

---

[۱] اس کتاب کو مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کر کے شایع بھی کیا ہے۔

تاہم مرورِ زمانہ اور زبان کی تدریجی ترقی اور تبدیلیوں کی وجہ سے آج کل اس زمانہ کی تحریروں میں گنجلک نظر آتا ہے۔

شمالی ہند کی نثری پیداوار کا آغاز مولانا فضلی کی دہ مجلس سے قرار دیا جاتا ہے جو ۱۱۴۵ھ کی تالیف ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا فضلی ہی شمالی ہند[1] میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر نویسی پر قلم اٹھایا ہے اسی بنا پر اب تک بھی بعض لوگ انھی کو اردو کا پہلا نثر نویس سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند دکن کی ادبی سرگرمیوں سے بہت بڑی حد تک بے خبر تھا۔ ذرائع آمد و رفت کی قلت اور بُعد مسافت کی وجہ سے اہل دکن کی علمی ترقیاں اور ان کے ادبی کارنامے کوہ بندھیاچل کے آگے نہ جا سکے۔ نظم سے جو عام وابستگی رہی ہے اس کی وجہ سے شعرائے دکن کا کچھ نہ کچھ کلام وقتاً فوقتاً شمالی ہند والوں کی بھی ضیافت طبع کرتا رہا۔ مگر اہل دکن کی نثر سے شمالی ہند کو واقف ہونے کا موقع ہی نہ ملا چنانچہ مولانا فضلی نے اپنی نثر نویسی کو ایک ایجاد اور اختراع سے تعبیر کیا ہے اور ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل" اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل۔ کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے۔ لہٰذا کوئی اس صنف کا نہ ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نہیں ہوا۔ مسمع "مولانا فضلی کے بعد مرزا سودا کا نثری دیباچہ کلیات اور مثنوی شعلۂ عشق

---

[1] ان کے شمالی ہند کے باشندہ ہونے میں بھی بعض تذکرہ نویسوں کو تامل ہے

کا خلاصہ اور پھر محمد حسین کلیم کا ترجمہ فصوص الحکم، حضرت شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ القرآن وغیرہ چند نثری کتابیں ہیں اس سلسلہ کی آخری کڑی عطا حسین خاں تحسین کی "نو طرز مرصع" ہے اور اس پر یہ فہرست ختم ہو جاتی ہے ان کتابوں کا تعلق بھی مذہب اور قصص و حکایات سے ہے تاریخ، سوانح عمری، اخلاق و معاشرت وغیرہ سنجیدہ موضوعات پر ایک بھی کتاب نہیں لکھی گئی۔

زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ان کی بنیاد زیادہ تر فارسی کی آراستہ و پر تکلف عبارتوں پر رکھی گئی تھی اور فارسی کی تقلید میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ جا بجا قافیوں کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔ صرف فعل و حرف ربط وغیرہ چند الفاظ اردو کے ہیں اور باقی سارے لفظ فارسی کے۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو کے نثری کارناموں کا جو سرمایہ ہے اس کی یہ حقیقت ہے۔ آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کالج نے نثر اردو کی عمارت کی نیو کس طرح ڈالی اور نثر نویسی کی کیسی اساسی تحریک کی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لیے وسیع تر میدان کھل گیا۔ اور اردو نثر کی شاندار عمارت چنی جانے لگی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ حصہ گل کرسٹ نے لیا ہے ان کی کوششوں نے اردو کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی فورٹ ولیم کالج کی

طرف سے جو کتابیں مرتب اور شائع ہوئی ہیں وہ عام طور پر صرف قصے کہانیوں تک محدود سمجھی جاتی ہیں مگر یہ ایک غلط خیال ہے۔ اگر کمپنی کے ارباب مقتدر، لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی تجویز پر خاطر خواہ توجہ کرتے تو یقیناً اردو زبان میں تاریخ و حکمت اور دیگر علوم کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہو جاتا۔ نظمائے کمپنی کی تنگ نظری اور اپنی تنگ دامنی کے باوجود بھی اس کالج نے تاریخ تذکرہ اور انتخابات دواوین کا اچھا خاصا ذخیرہ مرتب کر دیا اور اس کو ملک میں عام طور پر رائج کرنے کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر طباعت کا اہتمام بھی کیا ــــ آج ہندوستان میں پتھر کے چھاپہ سے روز بروز زیادہ بیزاری ظاہر کی جارہی ہے، ارباب کالج نے اس زمانے میں باوجود متعدد دقتوں کے ٹائپ کی طباعت کا اہتمام کیا تھا کالج کی اکثر کتابیں اسی خوش نما ٹائپ میں چھپی ہوئی اب بھی موجود ہیں۔

فورٹ ولیم کالج

تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب حقیقت سے سب واقف ہیں کہ انگریز اس ملک میں تجارت کے بہانے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ملک گیری اور تسخیر سلطنت شروع کر دی۔ ملک کے حالات نے ان کی مساعدت کی۔ مرکزی حکومت مغلیہ کی کمزوری اور صوبہ داروں اور راجاؤں کے آپس کے نفاق نے بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان پر حکمراں بنا دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کمپنی کی کوٹھیاں جو محض تجارتی اغراض اور اپنے مال و اسباب کے لئے بنائی گئی تھیں قلعوں سے بدل گئیں اور ان میں بجائے حفاظتی دستوں کے یورپی اور دیسی فوجیں اسباب جنگ و اسلحہ سے لیس رہنے لگیں اور کمپنی کو تجارت اور لین دین کے ساتھ جہانبانی و حکمرانی بھی کرنے لگی۔ ابتدا ہی سے کمپنی کو تجارتی اور حکومتی اغراض کے لئے اپنے یورپی ملازمین کو ہندوستان کی زبان، رسم و رواج اور طور طریقوں سے واقف کرانا پڑا۔

اس ضرورت کے مدنظر کمپنی کے نظمائے متعدد طریقوں پر وقتاً فوقتاً اپنے انگریز ملازمین کو یہاں کی دیسی زبانیں سکھانے کا انتظام کرتے رہے اور جوں جوں ان کا دائرہ عمل بڑھتا گیا، اس میں بھی ترقی و اضافہ کرنا پڑا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اردو زبان کی ترقی میں ایک ایسی قوم کو حصہ لینا پڑا جو اہل زبان یعنی ہندوستانیوں سے صورت شکل، رنگ، لباس، وضع قطع، اور رسم رواج ہر حیثیت سے جدا تھی۔ یہی قوم جس نے اہل ہند کے ہاتھوں سے ہندوستان کی حکومت چھین لی اور خود اس کی مالک بن بیٹھی، ان کی زبان کی ترقی کا باعث ہوئی اسی قوم کی بر وقت توجہ نے اہل ہند کی عام زبان یعنی اردو کی پرورش کی۔ اور اپنی مسیحا نفسی سے اس کے قالب مردہ میں جان ڈال دی۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول سے لے کر لارڈ ویلزلی تک ہر ایک انگریز حاکم اپنے اپنے عہد میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبانیں سکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام کرتا رہا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا ہے۔ اس خصوص میں سب سے پہلی منظم کوشش وارن ہیسٹنگز کی ہے۔ اس گورنر جنرل نے کلکتے کے انگریزی علاقہ میں ایک مدرسہ قائم کیا یہ دیسی کالج کہلاتا تھا اور اس میں زیادہ تر فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور انگریزوں کے علاوہ ہندوستانی طلبا بھی تعلیم پا سکتے تھے یہاں اردو یا دیگر ملکی السنہ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ عموماً

کمپنی کے ملازمین خانگی طور پر اردو نوشت و خواند کی مہارت پیدا کر کے اس کالج میں شریک ہو جاتے اور ایک دو سال میں کچھ ٹوٹی پھوٹی فارسی پڑھنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ اس کالج کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود تھا اور کمپنی کی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھا۔؟

۱۷۹۸ء میں لارڈ ویلزلی ارل آف مارنگٹن گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔ یہ نہایت اولوالعزم اور مدبر گورنر جنرل تھے اور اس عہدہ پر فائز ہونے سے قبل انگلستان میں کمپنی کی مجلس نظم ونسق کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے ہندوستان آتے ہی کمپنی کے کاروبار پر نظر غائر ڈال کر سب سے پہلے ملازمین کمپنی کو اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس کی اور ایک طویل و مدلل یادداشت لکھ کر نظمائے کمپنی سے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت چاہی اور اپنے غیر معمولی تدبر سے کام لے کر اس کے مصارت کے لیے نئی نئی راہیں سوچیں۔ پھر زیادہ دنوں تک کارروائی کو طول دیئے بغیر ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کو کالج کا افتتاح بھی کر دیا۔ یہی فورٹ ولیم کالج ہے۔ اس کے قیام سے پہلے اردو کی تعلیم کا عملاً کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا۔ اور کمپنی کے انگریز ملازم جو دیوانی، فوجداری اور دیگر اعلیٰ خدمتوں پر مقرر ہوتے تھے اپنے طور پر اردو کی تحصیل کیا کرتے تھے کمپنی ان کو تیس روپے فی کس الاؤنس خاص تحصیل زبان

فارسی کے لئے دیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے جو اردو کے اچھے عالم اور اس کے بڑے محسن و سرپرست تھے۔ خانگی طور پر یہ انتظام کیا کہ اپنے فرائض خدمت کے علاوہ ملازمین کمپنی کو اردو کی تعلیم دیا کریں۔ اس غرض سے انھوں نے اپنی ایک درس گاہ بھی قائم کی تھی اور ملازمین کمپنی کو اردو نوشت و خواند میں ماہر بنا کر فارسی کی تعلیم کے لئے فارسی داں ہندوستانیوں کے سپرد کرتے تھے آخر میں خود بھی اس کا انتظام کرنے پر آمادہ ہوئے اور اس کے لئے الاؤنس تحصیل زبان کے سوا کوئی اور معاوضہ نہ چاہا۔ عموماً کمپنی کے انگریز ملازمین نو عمر ہوتے تھے۔ انگلستان میں بھی ان کی تعلیم۔ اعلیٰ درجہ کی اور خاطر خواہ نہ ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ لوگ حقیقی معنوں میں کار داں اور اہل ثابت نہ ہو سکتے تھے، اسی بنا پر لارڈ ویلز لی نے کالج کی جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایشیائی زبانوں مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، بنگالی اور مرہٹی کے علاوہ یورپی زبانوں میں لاطینی، یونانی اور انگریزی اور علوم و فنون میں تاریخ عمومی، تاریخ ہند قدیم و جدید۔ تاریخ دکن، اصول قانون، شرع شریف، دھرم شاستر، جغرافیہ، شمالی ہند و دکن وغیرہ کی تعلیم کا انتظام چاہا تھا۔

کمپنی کے نظما اپنی تجارت کو فروغ دینا اور زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنا تو چاہتے تھے مگر وہ اس عظیم الشان کالج

کے مصارف کثیر کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ علاوہ ازیں لارڈ ویلزلی نے ملک گیری اور لشکر کشی میں کمپنی کا بہت سا روپیہ صرف کر دیا تھا اور نتظماء کمپنی ان کی اس دریا دلی سے سخت خائف تھے۔ گورنر جنرل کے بار بار اصرار پر کالج قائم کرنے کی منظوری دی مگر اس کو بجائے علم و فن کی عظیم الشان درس گاہ کے صرف مشرقی السنہ کا کالج قرار دیا۔ جب گورنر جنرل نے مزید کوشش کی تو کالج ہی کی برخاست کے احکام نافذ کر دیئے مگر پھر گورنر جنرل نے حکمت عملی سے ان کے اس حکم کی نظر ثانی کرائی۔ اور بہت کچھ تخفیف مصارف کے ساتھ اس کالج کو برقرار رکھا۔

لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنے تدبر و دانشمندی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب فارسی ہندوستان کی زبان نہیں رہی اور یہاں کی ملکی زبانوں میں صرف ہندوستانی یعنی اردو ہی ایک ایسی بسیط زبان ہے جو ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد دوسرا کام اس زبان کی ادبیات فراہم کرنے کا تھا۔ اردو کا سارا ذخیرہ صرف شعر و شاعری تک محدود تھا نثر سرے سے مفقود تھی اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ علوم کی کتابیں موجود ہی نہ تھیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک سررشتۂ تالیف و تراجم قائم کیا گیا اور اطراف ملک سے قابل افراد کو چن کر کلکتے میں ایک جا جمع کیا گیا اور ان سے

اردو نثر میں کتابیں لکھا ڈ جانے لگیں۔ تالیف و تراجم کا دفتر قایم کرنے کے بعد .... دوسری غور طلب بحث یہ پیش آئی کہ آیا قصص و حکایات، تاریخ و تمدن کی کتابیں از سرِ نو اردو میں تصنیف کرائی جایئں یا فارسی اور سنسکرت وغیرہ السنۂ قدیم میں جو ذخیرہ ان مضامین کا پہلے سے موجود اور عام طور پر ہندوستان میں مقبول ہے اس کو اردو میں منتقل کر لیا جائے۔ آخر الذکر صورت بہ لحاظ حالات و قرائن سہل اور زیادہ کارآمد تھی۔ اس طریقے پر تھوڑے ہی دنوں میں فارسی کا کافی ذخیرۂ ادب اردو میں منتقل ہو سکتا تھا یہی طریقہ سلامت روی کا ہے اور تقریبًا ہر زبان میں تصنیف و تالیف کے پیش رو ایسا ہی کر رہے ہیں عربوں نے پہلے یونانی علوم وفنون کی چوٹی کی کتابیں اپنی زبان میں منتقل کر لیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کی روشنی میں اعلیٰ تصانیف پیش کرنے کے قابل ہو گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے کئی سال بعد ہندوستان کے مجدد تعلیم سر سید رح نے بھی یہ ضرورت محسوس کی اور سائنٹیفک سوسائٹی قائم کر کے ہر علم و فن کی اعلیٰ کتابیں اردو میں ترجمہ کرانے لگے۔ جامعۂ عثمانیہ بھی اسی اصول پہ کاربند ہے۔ اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ، نے اس راز کو پا کر قیام جامعہ کے ساتھ ہی سر رشتہ تالیف و تراجم قائم فرمایا، جو مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ ترین کتابوں کو اردو میں منتقل کر رہا ہے۔ رفتار زمانہ کے مد نظر جیسا

کہ ہماری جامعہ کے مدبر امیر جامعہ نے اپنے خطبۂ صدارت[۱] میں ارشاد فرمایا تھا ضرورت ہے کہ اس کام کو صرف دار الترجمہ ہی پر نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ ہر ممکنہ طریقے سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون کا ذخیرہ جلد سے جلد اردو میں فراہم کر لیا جائے۔

چونکہ نظمائے کمپنی نے لارڈ ویلزلی کی اصل تجویز میں ترمیم و تبدیلی کر کے کالج کو صرف السنہ مشرقیہ اور بالخصوص اردو فارسی اور بنگالی کی تعلیم تک محدود کر دیا تھا اس لیے جو لٹریچر اس کالج کے اہل قلم نے تیار کیا اس کا بڑا حصہ اخلاقی اور افسانوی کتابوں کا ہے اور اس سے کسی قدر کم حصہ تاریخی کتابوں کا ہے۔ دیگر علوم و فنون کی کتابیں بہت کم تیار ہوئیں۔

کالج کی پروفیسریوں پر عموماً دیسی علما کو مامور نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں منشی یا پنڈت کا لقب دے کر درس و تدریس کے ساتھ تعلیم و ترجمہ کا کام لیا جانے لگا۔ یہ دیسی عالم انگریز پروفیسروں کے تحت دونوں فرائض انجام دیتے رہے۔ کالج کے قوائین اس طرح کے سخت تھے کہ غیر عیسائی شخص کو ذمہ دارانہ خدمت نہیں دی جاتی تھی۔ قیام کالج کے ساتھ ہی ڈاکٹر گل کرسٹ اس کے صدر اور اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ وہ اس عہدے پر صرف چار سال تک فائز رہے مگر اس قلیل مدت میں ان کی مساعی سے بہت کچھ تصنیف

---

[۱] خطبہ عالیجناب مہاراجہ بہادر امیر جامعہ ص ۱۹ بہ تقریب جلسہ عطائے اسناد بابتہ ۱۳۳۶ف

و تالیف کا کام انجام پایا اور ان کے جانشینوں نے کئی سال میں جو کام انجام دیا ہے وہ ان کے کام کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ کالج گو براہِ راست دینِ مسیحی کی تبلیغ نہیں کرتا تھا مگر بالواسطہ اس مذہب کی اشاعت کا کام بھی اس سے لیا گیا اور انجیل کا بھی اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اردو ادب کے افہام و تفہیم کے لیے اسلامیات سے واقف ہونے کی جو ضرورت ہے اس کے مدِّ نظر قرآن مجید کا بھی اردو میں ترجمہ کرانا شروع کیا تھا مگر بعد کو ان کے جانشینوں نے یہ کام بالکل موقوف کرا دیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد بھی جو انگریز اس کالج کی صدارت اور دیگر انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے وہ اکثر و بیشتر اردو کی سرپرستی اور اہلِ یورپ میں اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیتے رہے۔ یہ کالج عروج و زوال کے مدارج طے کرتا ہوا تقریباً کمپنی کے خاتمے اور ہندوستان پر حکومتِ برطانیہ کے تسلط تک جاری رہا۔ اس کی تالیفات و تراجم کمپنی کے دیگر مدارس میں اور عام ہندوستانیوں کے نزدیک مقبول ہوئے اور ملک میں ان کو رواجِ عام حاصل ہو گیا۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ

بلاشبہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اردو کے ان چند مخصوص محسنوں اور سرپرستوں میں سے ہیں جن کے بار احسان سے اردو زبان کبھی سبکدوش نہ ہوگی۔ رہتی دنیا تک اردو کے محسنوں میں ان کا نام باقی رہے گا۔ یہ انہی کی مسیحا نفسی تھی کہ اردو نثر کے قالب مردہ میں جان پڑ گئی اور اردو زبان نثر کی متعدد کتابوں سے مالا مال ہو گئی۔ اگر وہ اردو نثر نویسی کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور اہل زبان کو ان کے خواب غفلت سے بیدار نہ کرتے تو شاید ایک عرصہ تک اردو نثر اسی عالم جمود میں رہتی جو ان کی مساعی شروع ہونے سے قبل اس پر طاری تھا۔ یہ فقط اسی مشرق پسند انگریز کا طفیل ہے کہ اردو زبان میں نثر نویسی کو رواج عام نصیب ہوا اور جس عمارت کی بنیاد اس کے مبارک ہاتھوں نے رکھی تھی آج وہ سر بہ فلک بن گئی ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اردو زبان کی وسعت کی ایسی نئی راہیں نکالیں کہ متاخر اہل قلم ان

راہوں پر چل کر اپنی جولانیٔ قلم سے نہایت نمایاں اور درخشندہ کار نامے اپنی یادگار چھوڑ گئے اور چند ہی روز میں اردو جیسی کم سرمایہ زبان کو جس میں خط و کتابت کرنا بھی ثقہ لوگ معیوب سمجھتے تھے اس قابل بنا دیا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترکہ اور ایشیائی کی ایک وسیع زبان بن گئی اور ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اسی زبان میں علم و فن کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے حالات زندگی سے اردو کے تمام تذکرے خالی ہیں البتہ انگریزی کتابوں اور فورٹ ولیم کالج کی تاریخوں اور دیگر سرکاری کاغذوں میں ان کے جستہ جستہ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم کو بعض ایسی کتابیں نہ مل سکیں جن سے ان کے حالات پر خاطر خواہ روشنی پڑنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ جو کچھ مواد فی الوقت دستیاب ہو سکا اس سے مندرجۂ ذیل معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

ان کا پورا نام جان بارتھوک گل کرسٹ ہے۔ ان کی ولادت ۱۷۵۹ء میں انگلستان (اسکاٹ لینڈ) کے پایہ تخت اڈنبرا میں ہوئی ابتدائی تعلیم اسی شہر کے مدارس میں پائی۔ نوشت و خواند کی صلاحیت پیدا کرنے کے بعد طب کی تحصیل کا شوق ہوا اور اڈنبرا کی مشہور طبی درسگاہ میں جو "جارج ہیریٹ ہسپتال" کے نام سے موسوم تھی شریک ہوئے اور اس فن شریف کی تکمیل اسی درسگاہ میں کی۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار روز بروز ترقی پر تھے اور

انگلستان و الکاچستان کے نوجوان تعلیم یافتہ مختلف عہدوں پر مامور کر کے ہندوستان بھیجے جاتے تھے ڈاکٹر گل کرسٹ بھی طبی تعلیم سے فراغت پاکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے خواہاں ہوئے۔ کمپنی کے عہدہ داروں نے ان کی مستعدی و اعلیٰ قابلیت کے مد نظر ۱۷۸۲ء میں ان کو طبی عہدہ دار مقرر کیا اور یہ بمبئی پہنچے جہاں سے ایک سال کے بعد کلکتہ بھیجے گئے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے جیسا کہ وہ اپنی لغت کے دیباچے میں لکھتے ہیں ہندوستان آنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ جب تک میں اس ملک کے باشندوں کی عام زبان سے کماحقہٗ واقف نہ ہو جاؤں نہ میں اپنے فرائض خدمت خاطر خواہ طریقے پر انجام دے سکتا ہوں نہ خود مجھے اس ملک میں زندگی بسر کرنے میں لطف ملے گا۔ انہوں نے بمبئی ہی میں اردو زبان کو ہندوستان کی عام زبان ہونے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں بول چال کے لئے یکساں طور پر رائج ہونے کی وجہ سے سیکھنا شروع کیا اور دو تین سال میں سخت محنت اور کوشش سے اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ اوائل ۱۷۸۵ء میں سر جان میکفرسن نے جو وارن ہیسٹنگز کی جگہ منصرم گورنر جنرل تھے، انہیں تحصیل و تحقیق زبان اردو کے لئے خاص طور پر طویل رخصت دینا منظور کر لیا۔ یہ اپریل ۱۷۸۵ء میں ہی کلکتے سے نکل کر فیض آباد پہنچے اور ہندوستانیوں کی معاشرت اختیار کر کے بالکل ہندوستانی بنے۔

ہوئے ہمہ تن اردو زبان کے تحقیقی مطالعہ میں مصروف ہو گئے اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کے بعض مشہور شہروں جیسے دہلی بنارس اور لکھنؤ وغیرہ کا بھی دورہ کیا اور ہندو مسلمان پنڈتوں اور منشیوں کی مدد سے نہ صرف خود اردو کے ماہر زبان دان بن گئے بلکہ السنہ مشرقیہ اور بالخصوص اردو کے ساتھ ان کو ایسا شغف ہو گیا کہ اپنی تمام عمر اسی زبان کی تحقیق، توسیع و اشاعت میں صرف کر دی۔

ڈاکٹر گلکرسٹ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں پر ناقدانہ نظر ڈال کر ارباب مقتدر کو مطلع کیا کہ اب فارسی ہندوستان کے باشندوں کی زبان نہیں رہی۔ مسلمانوں کی حکومت کا دائرہ رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ جو علاقے کمپنی کے تصرف میں ہیں ان میں فارسی کو دفتری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں دیگر ملکی السنہ میں صرف اردو یا ہندوستانی کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے اور ضرورت ہے کہ اس عام بول چال کی زبان کی تحصیل کی جائے۔ ابتداء ان کی اس معقول تحریک پر جیسی چاہئے توجہ نہیں کی گئی مگر بعد ازاں یورپی ماہرین السنہ نے متفقہ طور پر ان کی رائے قبول کر لی ۱۸۳۲ء میں اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ اگرچہ اس وقت ڈاکٹر گلکرسٹ کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن مالوف کو واپس ہو چکے تھے، مگر ان کی اصابت رائے کمپنی کی مالی و ملکی ترغیبات میں بہت مفید ثابت ہوئی اور کمپنی کو نہایت

عمدگی سے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے اور عوام کا اطمینان و دل بستگی حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے مشرقی زبانوں میں مہارت حاصل کرتے ہی تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا اور اپنے ہم قوموں کو اردو زبان سکھانے کے لیے سب سے پہلے جن فنون کی ضرورت تھی مثلاً قواعد زبان۔ اور لغت وغیرہ ان پر کتابیں لکھیں۔ کمپنی کے دوسرے یورپی ملازمین کو تعلیم دینے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ان کو روزانہ اردو کے درس دیا کریں گے تاکہ یہ ملازمین اردو میں نوشت و خواند کی صلاحیت پیدا کر کے فارسی کی تحصیل کے قابل ہو جائیں خود بھی فارسی پڑھانے کا اہتمام کیا اور اس کے لیے تحصیل زبان کے الاؤنس کے سوا کوئی اور معاوضہ نہیں چاہا۔ ان کی اس تجویز کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل نے جو خود بھی السنہ مشرقیہ کے حامی و ہمدرد اور فورٹ ولیم کالج کے بانی تھے کونسل کے اجلاس میں بے حد پسند کیا۔

سنہ ۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز ہو کر ہندوستان آئے تو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انہوں نے سب سے پہلے کمپنی کے ملازمین کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک کالج۔ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی کالج کے قیام کے لیے نظمائے کمپنی سے مراسلت کرنے لگے کمپنی کے نظمائے کو اپنی تجارت کو

ترقی دینا اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا تو مقصود تھا۔ لیکن وہ کالج کے قیام کے مصارف برداشت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ گورنر جنرل کی متواتر کوششوں پر ۱۸۰۰ء میں ان کی اصل تجویزیں بہت کچھ تخفیف و ترمیم کر کے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کی منظوری دی۔ گورنر جنرل نے اس کالج کی صدارت کے لیے سب سے زیادہ موزوں ڈاکٹر گل کرسٹ کو پایا اور ان کی اردو دانی اور علمی خدمات کے مدنظر صدر مقرر کیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ اس عہدہ پر کچھ زیادہ دن تک فائز نہ رہ سکے اور خرابی صحت کی وجہ سے ان کو ۱۸۰۴ء میں علیحدہ ہو جانا پڑا۔ کمپنی نے ان کی مساعی جمیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے گورنر جنرل کی پرزور سفارش پر سالانہ تین سو پونڈ کا وظیفہ مقرر کر کے انہیں اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے چار سال کی قلیل مدت میں اطراف ہند سے لائق عالموں اور ماہر زبان اشخاص کو کلکتہ میں جمع کر کے ان سے بیسیوں مفید کتابیں ترجمہ کرائیں اور ان کی سرپرستی و حوصلہ افزائی سے ان لوگوں میں تصنیف و تالیف کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ ان کے وطن چلے جانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تالیف و ترجمہ کرتے رہے۔ اردو میں نظم کا ذخیرہ کافی تھا، صرف انتخاب کر کے صحت کے ساتھ شایع کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ

انھوں نے کالج کے منشیوں سے اردو شاعری کے قدیم اساتذہ کے پاکیزہ انتخابات مرتب کرائے اور ان کو نفاست و خوش سلیقگی سے شایع کیا۔ کالج کی نگرانی میں ٹائپ پریس بھی قایم کیا اور آج صحافت و علوم کی ترقی کے بعد جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے یعنی ٹائپ پریس وہ ان کی مساعی سے اس وقت رائج ہو چکا تھا اگر اس کو اور ترقی و رواج عام دیا جاتا تو آج اردو صحافت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ یہی چار سال کا زمانہ ڈاکٹر گل کرسٹ کا بہترین زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں انھوں نے وہ کام انجام دیا جس نے ان کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا۔

اگرچہ ڈاکٹر گل کرسٹ صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ دن تک کالج کی صدارت پر مامور رہ کر اردو ادب کی سرپرستی نہ کر سکے اور انھیں افسوس کے ساتھ اپنے پسندیدہ ملک ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا مگر علمی شغل اور اردو ادب کی خدمت کا شوق کسی طرح کم نہیں ہوا وہ چند روز اپنے وطن الکاچستان میں صحت کی خاطر بے کار رہے اور پھر تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا مگر وہاں اس کے لئے کافی مواقع حاصل نہ تھے اور نہ وہ خاطر خواہ کام کر سکتے تھے۔ اس لیے ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے اور یہاں ایک خانگی درسگاہ قائم کی جس میں ان نوجوان انگریزوں کو تعلیم دینے لگے جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کے امیدوار تھے۔ اور

ہندوستان میں کسب معاش کرنا چاہتے تھے۔

اس طریقہ پر کام کرتے ہوئے انہیں ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۸ء میں بہ مقام لیٹرا اسکویر ایک ادارۂ شرقیہ[1] قایم کیا اور اس میں اردو کی پروفیسری پر ڈاکٹر گل کرسٹ کو مامور کیا۔ یہ ادارہ خاص طور پر ان امید واروں کی تعلیم کے لیے قایم ہوا تھا جو کمپنی کی جانب سے طبی عہدہ دار بنا کر ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں نظمائے کمپنی نے تخفیف مصارف کے خیال سے اس مفید ادارے کو برخاست کر دیا اور ڈاکٹر گل کرسٹ بھی اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ادارے کی برخاست کے بعد بھی انہوں نے یہ کام اپنے طور پر جاری رکھا اور کمپنی کے امید واران ملازمت کو اردو سکھاتے رہے۔ اس طرح کئی سال کام کر کے لندن میں اردو دانوں کی ایک اچھی جماعت پیدا کر دی اور پھر پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنا تدریسی کاروبار سینڈفورٹ ارناٹ اور ڈنکن فوربس کے سپرد کر کے اپنے وطن چلے گئے اس کے بعد سے ان کی زندگی اجتماعی دلچسپی سے خالی رہی۔ چند دن انگلستان میں رہ کر صحت و علاج کی خاطر فرانس کا سفر کیا۔ اور فرانس ہی کے دارالحکومت

---

[1] اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ۔

پیرس میں ۸۸ برس کی عمر میں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو اردو کا یہ بے لوث بہی خواہ دنیا سے رحلت کر گیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف کا سلسلہ ۱۷۸۷ء سے شروع ہوتا ہے اسی سنہ میں انہوں نے اپنی مشہور انگریزی ہندوستانی لغت لکھنی شروع کی۔ ان کی تالیفی زندگی کا زمانہ کم و بیش تیس ۳۰ سال کا ہے۔ ذیل میں ان کی تمام اہم تالیفات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے جو لنگوسٹک سروے آف انڈیا کی جلد نہم مرتبہ سر جارج اے گریرسن اور خود ان کتابوں کے دیباچوں وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت ــــ یہ انگریزی اردو کی اولین مبسوط اور مستند لغت ہے جو نو سال کی متواتر محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے تحصیل زبان اردو کے ساتھ اس لغت کے مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب و طباعت میں مصروف رہے۔ ان کا یہ کارنامہ بذات خود اس قدر اہم ہے کہ اگر وہ کوئی اور کام نہ کرتے تو صرف اس سے ان کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے اردو زبان میں کوئی لغت نہ کسی ہندوستانی نے لکھی تھی اور نہ کسی یورپین نے جس کی وجہ سے ان کا کام بہت صبر آزما اور دقت طلب ثابت ہوا بڑی تلاش اور کوشش کے بعد انہیں صرف خالق باری مولفہ

حضرت امیر خسرو دہلی۔ اس کے سوا کوئی اور نمونہ ان کے آگے نہ تھا ڈاکٹر گل کرسٹ نے انگریزی لغتوں کو پیش نظر رکھ کر بالکل ابتدائی اور اصولی طریقے پر ادب کی اہم کتابیں جمع کیں اور منشیوں اور پنڈتوں کے معقول عملے کی مدد سے ان کتابوں سے الفاظ انتخاب کر کے ان کے معنی اور موقع استعمال کا تعین کیا۔ اس اہم کتاب کی اشاعت میں کمپنی نے بھی ان کی کسی قدر مالی امداد کی انہوں نے کتاب کے کئی حصے کر دیے خریداروں سے بالاقساط قیمت وصول کر کے کئی سال میں پورے طور پر اس لغت کی اشاعت کی۔ اس کا پہلا مکمل ایڈیشن ۱۷۹۲ء عیسوی شایع ہوا۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اپنے کام کی دشواریاں ذمہ داریاں طباعت کی پیچیدگیاں، وغیرہ، تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے کئی سال بعد ۱۸۱۰ء عیسوی میں جس کا دوسرا ایڈیشن خود ڈاکٹر گل کرسٹ نے بہت صحت اور اصلاح کے ساتھ انگلستان سے شایع کیا۔ اس موقع پر کپتان روبک نے بھی جو کلکتے میں ان کے جانشین ہوئے تھے۔ انہیں خاص طور پر اس کام میں مدد دی۔ اس ایڈیشن میں الفاظ کے معنی بھی رومن حروف میں دیے گئے ہیں اور پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے بڑی کوشش اور توجہ سے ایسے قاعدے اور اشارے تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ الفاظ اردو تلفظ میں غلطی نہ ہو۔ اس ایڈیشن کے ساتھ اردو قواعد کا بھی ایک بسیط خلاصہ جو ابتداءً علم اللسان اردو کے سلسلے میں لکھا گیا تھا شریک کیا گیا ہے اس اڈیشن کے مطابق

انگلستان میں کئی اور ایڈیشن شایع ہوئے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی اس لغت کے نسخے آج کل بہت کم یاب ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا ایک قدیم نسخہ مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانے میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک نسخہ ہے۔ سٹی کالج کے کتب میں سنہ ۱۸۲۵ء عیسوی کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جو سنہ ۱۸۱۰ء کے مرممہ نسخے کی طباعت دوم ہے۔ یہ نسخہ بہت عمدہ حالت میں ہے۔

۲۔ ہندوستانی علم اللسان۔ یہ اردو کی لسانیات پر ایک دلچسپ تصنیف ہے اس میں انگریزی اردو اور اردو انگریزی کی ایک طویل فرہنگ بھی دی ہے۔ نیز اردو کے قواعد زبان پر ایک عالمانہ مقدمہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کب شایع ہوا معلوم نہیں دوسرا ایڈیشن کپتان ٹامس روبک نے بہت کچھ اضافوں اور ترمیم کے بعد اڈنبرا سے سنہ ۱۸۱۰ء میں شایع کیا۔ لندن سے ڈاکٹر گل کرسٹ نے سنہ ۱۸۲۵ء میں تیسرا ایڈیشن نکالا تھا۔

۳۔ اردو کی صرف و نحو۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ سلسلہ علم اللسان اردو کی جلد اول کا تیسرا حصہ ہے ۱۷۹۶ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شریک کی گئی اس ضرورت سے اس کے دو چار ایڈیشن جلد جلد شایع

ہوئے میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۳ء میں "اردو رسالہ گل کرسٹ" کے نام سے اس کا ایک خلاصہ بھی مرتب اور شائع کیا تھا۔

۴۔ **مشرقی زبان داں** — یعنی "ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان کا آسان مقدمہ" اس کے ساتھ بھی انگریزی اور اردو انگریزی الفاظ کی ایک مبسوط فرہنگ ہے۔ ایک ضمیمہ آلات جنگ کے اردو اسما پر بھی شریک کیا گیا ہے اور ایک علیحدہ عنوان سے زبان کے ابتدائی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۷۹۸ء اور دوسرا ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔

۵۔ **اردو زبان پر مختصر مقدمہ** یہ "مشرقی زباندان کا خلاصہ ہے جو ۱۸۰۰ء

میں کلکتہ سے شائع ہو تھا۔

۶۔ **ہندی کی آسان مشقیں** — یہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات کی تیاری کرنے والے امیدواروں کی سہولت کے لیے مرتب کی گئی تھیں۔ ان کی پہلی اشاعت ۱۸۰۱ء میں ہوئی۔

۷۔ **فارسی افعال کا جدید نظریہ** — افعال کی بحث پر یہ

.... یہ مفید کتاب خود مصنف نے اپنے اہتمام سے ۱۸۰۱ء میں چھپائی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں نکلا افعال پر بحث کرنے کے بعد مختلف افعال کے انگریزی اور اردو میں مترادفات بھی دیے ہیں۔

۸—اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو—

یہ کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ نے انگریزوں کو اردو زبان میں جلد سے جلد دستگاہ پیدا کرانے کے لیے بڑے غور و خوض کے بعد مرتب کی تھی اس کی اشاعت پہلی مرتبہ کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں لندن سے شایع کیا گیا۔ اپنے قیام لندن کے زمانہ میں مصنف نے اس کی نظر ثانی کی اور اصلاح و اضافہ کے بعد ۱۸۲۰ء میں تیسرا ایڈیشن شایع کیا۔

۹—بیاض ہندی— یہ ڈاکٹر گلکرسٹ کا وہ دلچسپ انتخاب ہے جس کو فورٹ

ولیم کالج کے مشاہیر اہل قلم کے کارناموں کا گلدستہ کہنا چاہیے اس میں کالج کے تقریباً تمام بلند پایہ مولفین کی کتابوں کے نمونے شامل ہیں اس انتخاب کی ترتیب میں میر عبداللہ مسکین نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ انتخاب ۱۸۰۳ء میں طبع ہوا تھا۔

غالباً اس کا صرف یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ اس انتخاب کے مطالعہ سے مصنفین فورٹ ولیم کالج کے طرزِ بیان اور اس عہد کی اردو نثر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ **عملی خاکے** — اردو الفاظ کی قرأت اور ان کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے اصول پر ایک مختصر مگر مفید رسالہ ہے یہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا۔

۱۱۔ **ہندی الفاظ کی قرأت** — یہ مذکورہ بالا رسالہ کی طرح ہندی الفاظ کی قرأت کے اصول و ضوابط پر بسوط و مدلل بحث ہے غالباً یہ مذکورہ بالا رسالہ کی مرمّمہ صورت ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۰۴ء میں ہوئی تھی۔

۱۲۔ **اتالیق ہندی** — اس میں ایسے سلیس اور آسان مضامین کالج کے مختلف اہلِ قلم سے لکھوا کر جمع کئے گیے ہیں جن کے مطالعہ سے اردو نوشت و خواند آسانی سے سیکھ لی جا سکتی ہے۔ اور اس کا مقصد فارسی سیکھنے والوں میں ابتدائی استعداد پیدا کرنا ہے مضامین کے سلسلے میں فارسی صرف و نحو کے ابتدائی مسائل پر بھی بحث کی ہے اور فارسی کے بعض سلیس مضامین کے اردو ترجمے

بھی شامل کیے گئے ہیں اس کے تین ایڈیشن ۱۸۰۲ء اور ۱۸۲۱ء
میں شائع ہوئے۔

۱۳۔ ہندی عربی آئینہ۔ عربی کے ایسے الفاظ کی جدولیں جو اردو زبان کے
ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں کلکتہ
سے شائع کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں کہ دوسرا ایڈیشن بھی نکلا یا نہیں۔

۱۴۔ مکالمات انگریزی و ہندوستانی ۔

اس کتاب میں اہل یورپ کو بول چال سکھانے اور روزمرہ
ضروریات کی باتوں پر ہندوستانیوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا
سامان جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب انگریزوں کے لیے اردو سیکھنے
میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ اس کے متعدد
ایڈیشن کلکتہ۔ اڈنبرا اور لندن سے شائع ہوئے۔

۱۵۔ مشرقی قصے۔ اس میں حکایات لقمان اور دیگر مشرقی حکایتوں اور افسانوں
کا ذخیرہ انگریزی، فارسی، برج بھاشا، اور سنسکرت کی کتابوں
سے ترجمہ کر کے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی تدوین میں کالج کے دیگر اہل
قلم نے بھی بہت کچھ مدد دی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۰۳ء
میں ہوئی۔

۱۶۔ ہندی داستان گو — اس میں فارسی اور دیو ناگری رسم الخط اور اردو میں ان کے استعمال پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف کی مذکورہ بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ ان کا مقصد انگریزوں کو اردو سکھانا تھا اور ان سے خود ہندوستانی کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے یہ سچ ہے مگر ان کی یہ مساعی بھی بالواسطہ اردو کی نثر و اشاعت اور سمندر پار ممالک کے باشندوں کو اردو زبان سے مانوس کرانے کی وجہ سے بے حد قابل قدر رہیں۔ اگر ان کے بعد آنے والے انگریز حاکم بھی ان کی طرح اردو کی سرپرستی کرتے اور وفاتر و مدارس میں انگریزی کو جاری وساری کرنے کی جگہ اردو ہی کی وسعت اور اس کی تحصیل میں دلچسپی لیتے تو آج اردو کی دنیا نہایت ہی وسیع ہوتی اور اس کا حلقۂ اثر بھی انگریزی کی طرح دنیا کے ایک بڑے حصّہ کو گھیر لیتا۔ افسوس کہ انگریزوں نے بہت جلد اس زبان کی طرف سے نہ صرف اپنی توجہ ہٹائی بلکہ اس کو سرکار دربار سے بھی نکال باہر کیا اور کسمپرسی کی حالت میں خود اہل زبان یعنی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر اردو کو ترقی ہونی تھی جو باوجود سارے ہندوستان میں انگریزی زبان کا تسلط عام ہو جانے کے اس

نے ترقی کی اور آج اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ برابر ترقی کے قدم بڑھائے جا رہی ہے۔ وہ دن کچھ دور نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی بدولت جس نے اس دور حاضر میں اردو کی عدیم النظیر سرپرستی شروع کی ہے۔ اردو زبان علوم و فنون کے تمام ذخائر و خزائن سے مالا مال ہو جائے اور دنیا کی مشہور اور بلند پایہ زبانوں میں شمار ہونے لگے۔

قواعد زبان اور تدوین لغت پر اہل زبان نے اپنے استغنا کی وجہ سے بالکل توجہ نہیں کی اور اردو کی جو کچھ ابتدائی کتب صرف و نحو لکھی گئیں وہ اہل یورپ ہی کی ہیں اہل یورپ کو ہندوستان میں تجارتی اغراض کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی مشہور قواعد اردو کے طویل دیباچہ میں اس کی پوری تفصیل دی ہے۔ اہل زبان میں صرف ایک انشاءاللہ خاں ہی ایسے ہیں جنہوں نے اس زمانہ میں جبکہ ان کے معاصرین صرف مشاعروں میں غزلیں پڑھنے اور شعر و شاعری سے مجالس و دربار گرمانے میں مصروف تھے۔ اس ضروری اور مفید کام کی طرف توجہ کی اور دریائے لطافت سی لطیف و پُر مغز کتاب لکھ ڈالی۔ ان کا یہ کارنامہ ان کی ساری عمر کی کمائی یعنی کلیات سے زیادہ شہرت و وقعت کا مستحق ہے اور رہے گا۔ انگریز مولفین قواعد میں ڈاکٹر گل کرسٹ کو اولیت حاصل ہے۔ انگریزی اردو لغت بھی سب

سے پہلے انہوں نے ہی لکھی ہے۔ ان کے بعد اور بھی انگریزوں نے مثلاً ڈنکن فاربس۔ ڈاکٹر فیالن، جان شکسپیر اور جوزف ٹیلر وغیرہ نے ان کی تقلید میں لغات لکھیں اور اس طرح اردو کی نشر واشاعت میں نمایاں حصّہ لیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ انگریزی کی جامع لغتوں کی طرز پر اردو انگریزی لغت مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اور ۱۷۹۶ء میں اس کا ایک حصّہ شائع کر کے اصل کام کی بنیاد ڈالی۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے خیال کے موافق اس تجویز میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس راہ میں انہیں طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے

قواعد اردو مولفہ عبدالحق ص ۳

ٹامس روبک اور جوزف ٹیلر

اردو صرف جان گل کرسٹ بلکہ اور بھی بہت سے انگریز حاکموں اور عہدداروں کی منظور نظر رہی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں کے علاوہ بہت سے انگریز اور فرانسیسی محقق اردو تعلیم اور نشرواشاعت میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ فرانسیسی محقق ارد و گارساں دی تاسی نے تاریخ ادبیات اردو اور خطبات کی صورت میں اپنی عظیم الشان یادگار چھوڑی ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک کے باشندوں نے اردو کی قواعد اور لغت وغیرہ کی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ہم کو فی الوقت اپنے مقصد کے لیے ان پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور جانشین کی حیثیت سے یہاں صرف دو انگریز محسنینِ اردو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر یورپی محسنانِ اردو کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو ایک علیحدہ...... کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

کپتان ٹامس روبک۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اردو اہلِ قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی

وابتداءً فوج میں ملازم ہوئے اور لفٹنٹ اور پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی۔ ان کو اردو زبان اور اس کے ادب سے خاص شغف تھا۔ جی اکڑ گل کرسٹ کے فیضِ صحبت سے ان میں اردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا تھا، وہ پہلے فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے۔ جب ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی صدارت اور اردو کی پروفیسری سے سبکدوش ہو گئے تو یہی ان کی جگہ مامور ہوئے۔ مصنفیں اور مولفیں کی سرپرستی کر کے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے مصنفین اور اہلِ قلم کو تصنیف و تالیف کی ترغیب دی اور متعدد کتابیں شائع کرائیں۔ ان میں سے ایک منشی بینی نارائن جہاںؔ ہیں جو کپتان روبک ہی کے بدولت مصنف ہے۔ کپتان روبک کو عام نثری کتابوں کے علاوہ اردو شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن جہاںؔ سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھوایا مرزا جان طپشؔ نے جو کلکتہ کے مشہور شاعر اور فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے۔ اپنی مثنوی بہارِ دانش میں ان کی تعریف عجیب پر لطف انداز میں کی ہے۔

پھر آگے کہاں وہ زبانِ بیاں | ادا ہو جو کپتان صاحب کی شاں
شریف النسب اور گرامی شکوہ | حکیم و خردمند و دانش پژوہ
امارت میں شوکت میں عالی طریق | بہ تسخیر دلہا شفیق و خلیق
ہنر سنج و وقاف و معنی شناس | سخن کے سخنداں کا ہے جس کو پاس

شرف جس سے تدریس کو ہی ملا — دیا جس نے تعلیم کو مرتبا
زبس ہے سب آگاہ علم و کمال — دقایق میں ہے تحتے کے مثال
کہیں کیوں نہ ہم اس کو طوطی مقال — کہ ہندی زباں کا ہے صاحب کمال
حق اس کے تئیں نت سلامت رکھے — سلامت رکھے با کرامت رکھے

کپتان روبک "ہندوستانی لغت" کی تدوین میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح ممد و معاون تھے بطور خود بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں ایک "لغت جہاز رانی" ہے اس میں بحر بر اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو میں جمع کیے گئے ہیں اور ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی ذخیرہ کثیر ہے جو انگریز کمانڈروں کو میدان جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کار آمد ہو سکتے ہیں پھر اردو کی قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی اس کے ساتھ میں بطور ضمیمہ شریک کیا۔ اس مفید لغت کی پہلی اشاعت کلکتہ سے سنہ ۱۸۱۱ء میں ہوئی دو سال بعد...... دوسرا ایڈیشن لندن سے شایع ہوا۔

کپتان روبک کی دوسری کتاب "ترجمان ہندوستانی" (ہندوستانی انٹرپریٹر) ہے اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل مندرج ہیں یہ کتاب پہلے لندن سے سنہ ۱۸۲۴ء میں اور پھر پیرس و لندن سے سنہ ۱۸۴۱ء میں شایع ہوئی تھی۔ اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے کپتان روبک

نے ان کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی ایک بسوط تاریخ بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے۔

کپتان ٹیلر کپتان جوزف ٹیلر بھی اردو زبان کے دلدادہ اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے پروفیسر تھے انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ اور کپتان روبک کی طرح ایک بسیط اردو ...... انگریزی لغت مرتب کی ہے ابتداً اپنے ذاتی استعمال کے لیے بطور فرہنگ تیار کی تھی۔ پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ایم، ڈی کی مدد سے اس کو باضابطہ مرتب و شایع کیا ڈاکٹر ہنٹر بھی کالج میں ملازم اور اردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے طپش نے ان کی بھی مدح کی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

چل اے خامہ کالج کی توصیف کر
ہوئے مجتمع جس میں اہل ہنر

فصاحت بلاغت کا ہے جو مقام
جو ہے تربیت گاہ ہر خاص و عام

رہے ڈاکٹر ہنٹر اس میں سدا
ہر اک اہل حاجت کا حاجت روا

تبسم، تمکین، ترحم، کرم
عیاں اس کے سیما پہ ہے دمبدم

ہے وابستہ اس سے ہر اہل سخن
کہاں ایسے ہوتے ہیں آگاہ فن

شرف اس نے ہندی زباں کو دیا
دیا نظم اردو کو یہ مرتبا

ترقی سب اس کی اسی سے ہوئی
ہوئی قدر اس سے تصانیف کی

کپتان ٹیلر کی لغت بھی نہایت کار آمد ہے اس کی تدوین میں کالج کے دیسی علما نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ اس کا پہلا

ایڈیشن کلکتہ میں ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا تھا پھر ولیم کارمیکائیل اسمتھ نے اس کی نظر ثانی کر کے ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر دونوں نے اردو نثر نویسوں کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان ہی اردو پسند انگریزوں کی بدولت فورٹ ولیم کالج قائم رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔

میر امّنؔ دہلوی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نثر نویسوں میں تین شخص خاص طور پر مقبول انام ہیں (۱) میر امّن دہلوی (۲) میر شیر علی افسوس (۳) سید حیدر بخش حیدری۔ ان میں بھی سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت صرف میر امّن ہی کے حصہ میں آئی۔ اس کالج کے مصنفوں میں سے اکثر نے بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں بعض تو شاعر اور اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے نثری کتابوں کے علاوہ اپنے اشعار بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں مگر میر امن کو دیکھو تو صرف دو کتابوں کے مولف ہیں اور ان سے بھی ایک کو تو شہرت نصیب نہ ہوئی اور بہت کم لوگ اس کے نام سے واقف ہیں۔ رہی دوسری تو یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ میر امن کا نام جب تک اردو زبان زندہ ہے اور اردو بولنے والی قوم دنیا کے پردہ پر باقی ہے مٹ نہیں سکتا۔ ان کی کتاب "باغ و بہار" کی بہار ہمیشہ تازہ ہے۔ اس کو تالیف ہوئے سوا سو برس کا زمانہ دراز گزر گیا مگر اس کو مقبولیت میں کمی نہ ہوئی یہ مصرع گویا اسی کے متعلق لکھا گیا تھا ع ہے تازگی وہی پر اس قصہ کہن میں

میر امن کے حالات زندگی سے اردو کے تقریباً تمام تذکرے خالی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے وہ شاعر نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو شعر و شاعری کی بدولت ان کی کچھ شہرت نہ ہوئی اور کسی تذکرہ نویس نے ان کا حال اپنے تذکرہ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں دیکھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا اصلی نام میر امان تھا۔ اور امنؔ تخلص ہے مگر وہ میر امن ہی کے نام سے مشہور رہیں۔ ان کا مولود وطن دہلی ہے ان کو دلی پر اور دہلی کو ان پر ناز ہے اور بجا ہے۔ ان کے آباو اجداد بیرون ہند کے رہنے والے تھے اور خاندان مغلیہ کے دوسرے فرماں روا ہمایوں بادشاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان میں وارد ہوئے۔ غالباً آگرہ میں قیام اختیار کیا ہوگا۔ ہمایوں بادشاہ سے لیکر عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) کے ایام فرمانروائی تک ان کا خاندان شاہان مغلیہ کے رکاب سعادت میں ملازم رہا اور ان کے آباؤ اجداد پشت بہ پشت بادشاہ کی پیشی میں حاضر اور اپنی جاں فشانی و جاں بازی کی وجہ سے مورد الطاف و عنایت رہے۔ اعلیٰ خدمات کے علاوہ وہ جاگیر و منصب بھی ملا اور امرائے مغلیہ میں شمار کیے جانے لگے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ میر امن دہلی ہی پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور اساتذہ دہلی ہی سے علوم متداولہ حاصل کیے بچپن سے تیس چالیس سال تک کی عمر اسی "اجڑی ہوئی دہلی"

میں گزاری۔ میرامن کے والد کا آخری اور ان کے بچپن اور جوانی کا سارا زمانہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کا دور تھا۔ بادشاہ کمزور و عیش پسند تھے۔ ان میں جہاں بانی و کشور کشائی کی نہ تو امنگ باقی تھی اور نہ قابلیت ہی رہی تھی۔ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وزراء امراء اپنی خودمختاری کی فکریں کرنے لگے۔ مگر خود ان کے آپس میں آئے دن کے جھگڑوں نے بیرونی بادشاہوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جراءت دلائی۔ سرکشوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اندرون و بیرون ملک کی تمام چھوٹی اور بڑی طاقتیں اپنی تقویت و ترقی میں سرتوڑ کوششیں کرنے لگیں۔ کچھ عجیب طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ آج ایک "صاحب عالم" تخت نشیں ہوتے ہیں اور کل انہی کو تہ تیغ کر کے بادشاہ گر امرا دوسرے دعویدار سلطنت کے سر پر تاج پہناتے ہیں۔ اس افراتفری کو دیکھ کر سرحدی قبائل کے سرداروں اور افغانی حکمرانوں کو لوٹ مار کا شوق ہوا۔ اور وہ اپنے پوشیدہ ارادوں کو کامیاب بنانے لگے۔ احمد شاہ درّانی درّاتا ہوا اپنی تازہ ولایتی فوج لے کر دہلی میں داخل ہوا اور ۱۷۵۶ء میں دلّی کی ساری دولت لوٹ لی۔ بادشاہ پہلے ہی شطرنج کے شاہ تھے اب اور بھی مجبور ہو گئے۔ دولت کے ساتھ اقتدار بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر جس کے جی میں جو آیا کر گزرا۔ سورج

مل جاٹ بھرت پوری نے چھوٹے چھوٹے امرا کی جاگیریں ضبط کرلیں اور دلی پر کچھ اس طرح کی تباہی و بربادی چھا گئی کہ اچھے اچھے گھرانے تباہ ہو گئے۔ لوگ دلی چھوڑ کر بھاگنے لگے اور جہاں جس کو پناہ ملی وہیں کا ہو رہا۔ میر امن خاندانی مناصب و اعزاز کھو کر بھی ایک زمانہ تک دلی ہی میں رہے مگر بقول غالب ع

ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائینگے کیا

آخر وہ بھی نہ ٹک سکے اور عسرت و سراسیمگی کی حالت میں بر یک بینی و دو گوش تلاش معاش میں چل کھڑے ہوئے۔

دہلی سے نکلنے کے بعد طے منازل و قطع مراحل کرتے ہوئے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے اور یہاں بری بھلی طرح چند سال بسر کیے۔ آخر جب کچھ بناہ نہ دیکھا تو اہل و عیال کو وہیں چھوڑ کر تن تنہا کسی اچھی نوکری کی تلاش میں نکلے اور کلکتہ جا پہنچے۔ نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کا اتالیق بنایا دو سال یہ نوکری بھی کی مگر یہاں بھی کچھ نباہ نہ ہو سکا۔

ان ہی دنوں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے لیے لائق ادیبوں اور ماہر منشیوں کی ضرورت داعی ہوئی اور ہندوستان کے مختلف حصص سے لائق لوگوں کو بلوا کر اس کالج میں ملازمت دی جانے لگی میر امن کے دوست منشی میر بہادر علی حسینی اس کالج کے میر منشی تھے۔ میر امن

بھی ان کے وسیلہ سے ڈاکٹر گل کرسٹ تک پہنچ گئے اور انہوں نے ان کی لیاقت و زبان دانی دیکھ کر ان کو کالج میں ملازم رکھ لیا۔ یہ ملازمت مستقل تھی یہاں ملازم ہو کر میر امن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بیوی بچوں کو بھی عظیم آباد سے کلکتہ بلوالیا۔

میر امن کی نہ تو تاریخ پیدائش معلوم ہے اور نہ تاریخ وفات اور نہ ٹھیک طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے۔ البتہ اس کا تعین کرنا آسان ہے اور ہم بلا کسی شک و شبہ کے یہ قرار دے سکتے ہیں کہ وہ اوایل ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج کی سلک ملازمت میں منسلک ہوئے یہاں ان کی علمی خدمات کا سلسلہ کس سنہ تک جاری رہا۔ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی موجودہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء کے آخر تک پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں اس کے بعد انہوں نے کیا کام کیا اور کونسی کتابیں لکھیں کچھ حال معلوم نہیں۔ البتہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ ۱۸۰۲ء کے بعد سے تصحیح و نظرثانی کتب اور قدیم اساتذہ کے دواوین وغیرہ کے انتخاب کا کام کیا ہوگا۔ کیوں کہ کالج کی طرف سے بہت سی نظم کی کتابیں اور دواوین اساتذہ کے انتخابات نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ شایع ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ان کا تخلص امن تھا۔ سیر المصنفین کے مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ کبھی اپنا تخلص لطف بھی کرتے تھے

مگر کوئی سند یا حوالہ نہیں بیان کیا۔ البتہ "باغ و بہار" کے خاتمہ پر میر امنؔ نے جو ابیات لکھی ہیں ان کی آخری بیت یہ ہے۔

تو کونین میں لطف بہر لطف رکھ   خدایا بہ حق رسول کبار

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف بھی تخلص کرتے تھے۔

میر امنؔ باضابطہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری ان کا پیشہ تھی وہ کبھی کبھی دل کی اُپج اور طبیعت کی موزونیت سے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر فیلن مشہور یوروپین اردو داں و مصنف لغات اردو نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ میر امنؔ خود فرمایا کرتے تھے کہ شاعری میرا پیشہ نہیں ہے نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اردو ٹکسالی اردو ہے کیونکہ میں دلّی (اقبال) جہاں آباد کا رہنے والا ہوں اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں" اس کے علاوہ میر امنؔ نے اپنی کتاب "گنج خوبی" کے دیباچہ میں اپنے پیشہ ور شاعر نہ ہونے کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی ہاں مگر خود بخود جو کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا استاد نہ کسی کا شاگرد۔ بیت

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی   فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی[1]

میر امنؔ کے یہ حالات زیادہ تر خود ان ہی کے مختلف بیانات

---

[1] گنج خوبی مطبوعہ مطبع محبوب بمبئی سنہ ۱۲۹۲ء

سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھے ہیں دیباچے کے اس حصہ کو نقل کرنا جب کہ ہم اوپر حالات بیان کر چکے اس طویل سے خالی نہیں مگر اس لحاظ سے کہ میرامّن نے اپنا ذکر بھی اپنے مخصوص رنگ میں عجیب لطف کے ساتھ لکھا ہے اس کے کچھ حصّے کا اعادہ بے جا نہ سمجھا جائے گا اس بیان سے بعض نئی باتیں جن کو ہم نے اوپر نہیں بیان کیا ہے ظاہر ہو جائیں گی۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالامال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر دیسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا۔ غارت ہوا۔ میں بےکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے کتنے برس بلدہ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ

بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بے کاری گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسی جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدر داں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"[1]

باغ و بہار میر امن صرف دو کتابوں کے مترجم یا بالفاظ دیگر مولف ہیں کیوں کہ ان کی دونوں کتابوں میں تالیف کی شان پائی جاتی ہے وہ نرے ترجمے نہیں ہیں ان کی پہلی کتاب "باغ و بہار" ہے اس کی تالیف ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۱ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۲۱۷ھ میں انجام کو پہنچی۔ خاتمۂ کتاب میں میر امن لکھتے ہیں۔

---

[1] دیباچہ باغ و بہار ص مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۳ء

جب یہ کتاب فضل الٰہی سے اختتام کو پہنچی جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اسی میں تاریخ نکلے جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں لکھنا شروع کیا تھا باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ سن کی ابتداء میں انجام ہوئی۔ اسی فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے۔ ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے تب میں نے یہی نام رکھا۔

اس کے بعد یہ ادبیات لکھی ہیں جن سے کتاب کے متعلق خود مولف کے کیا خیالات و توقعات تھے ظاہر ہیں۔

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھے سن بارہ سو سترہ در شمار
کرو سیراب اس کی تم رات دن — کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار
خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ — ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار
میرے خون دل سے یہ سیراب ہے — اور لخت جگر کے ہیں سب برگ و بار
مجھے بھول جاویں گے سب بعد مرگ — رہے گا مگر یہ سخن یادگار
اسے جو پڑھے یاد مجھ کو کرے — یہی قاریوں سے مرا ہے قرار
خطا گر کہیں ہو تو رکھیو معاف — کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
ہے انسان مرکب زسہو و خطا — یہ چوکے گا ہر چند ہو ہوشیار
میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں — یہی ہے دعا میری اے کردگار
تری یاد میں میں رہوں دم بدم — کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھو — نہ شب گور کی اور نہ روز شمار

ـــــ خاتمۃ الکتاب باغ و بہار ص (۲۵۹)

خدایا بہ حق رسول کبار   تو کونین میں لطف پر لطف رکھ[1]

"باغ و بہار"، فارسی قصہ "چہار درویش" کا آزاد اردو ترجمہ ہے اس کی تصنیف اور میر امّن کے اردو میں ترجمہ کرنے کی تقریب خود ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسروؒ دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخشؒ جو ان کے پیر تھے۔ (اور درگاہ ان کی قلعہ میں تین کوس لال دروازہ کے باہر مٹیا دروازہ سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا۔ خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔[2]

---

[1] خاتمۃ الکتاب۔ باغ و بہار ص (۲۰۱)، [2] باغ و بہار صفحہ (۳)

اگرچہ عام طور پر یہی روایت مشہور ہے کہ یہ قصہ ابتداءً امیر خسرو نے لکھا تھا اور خود میر امّن بھی اوپر یہی روایت نقل کرتے ہیں لیکن اس کو امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قصہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں تصنیف ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق اور پروفیسر شیرانی نے بڑی تحقیق سے اس روایت عام کی تردید کی ہے۔ میر امّن سے کئی سال قبل میر محمد عطا حسین خاں تحسینؔ نے اس قصہ کو اردو میں ترجمہ کر کے "نو طرز مرصع" نام رکھا تھا میر امّن نے تحسینؔ کے نسخے کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اکثر صورتوں میں اسی ترتیب وغیرہ کی پابندی کی ہے۔ اس موقع پر ہم تحسینؔ کا بھی کچھ ذکر کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ تحسینؔ میر باقر خاں شوقؔ کے بیٹے اور اٹاوہ کے رہنے والے تھے وہ "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور تھے۔ انہوں نے ابتداءً جنرل اسمتھ کے منشی کی حیثیت سے کئی سال کلکتہ میں گزارے جب جنرل اسمتھ نے ہندوستان کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن مالوف انگلستان کی راہ لی تو پٹنہ چلے گئے۔ اور وہاں کی دیوانی عدالتوں میں وکالت کرنے لگے پھر چند سال کے بعد اپنے والد شوقؔ کے قضا کر جانے پر پٹنہ سے نکل کر فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء) کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین نواب آصف الدولہ کے متوسل رہے اور ان ہی کے عہد حکومت میں قصہ چہار درویش کو مکلف

اردو میں "نو طرز مرصع" کے نام سے مرتب کیا مولانا آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ تحسین نے ۱۷۹۸ء م ۱۲۱۲ھ میں چہار درویش کو اردو میں ترجمہ کیا مگر یہ تاریخ غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور تحسین نے "نو طرزِ مرصع" میں جو قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بقیدِ حیات تھے۔ غرض یہ ترجمہ ۱۷۹۷ء کے قبل ہوا تھا تحسین نے اس کے علاوہ فارسی میں تین اور کتابیں (۱) ضوابطِ انگریزی (۲) تواریخ قاسمی (۳) انشائے تحسین تحسین معمولی درجہ کے شاعر تھے اور اس لیے ان کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے حتیٰ کہ لالہ سری رام مؤلف "خمِ خانہ جاوید" نے بھی نہیں۔ کیا ہے۔ حالاں کہ وہ ان لوگوں کا بھی ذکر اپنے بسیط تذکرہ میں کرتے ہیں۔ جو صرف ایک آدھ شعر لکھ کر مشہور ہو گئے۔ مولانا آزاد نے اپنے گراں پایہ تذکرہ "آبِ حیات" میں تحسین کا ذکر اردو نثر کے پیش رو ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔

تحسین کی "نو طرزِ مرصع" بالکل مقبول نہیں ہوئی اس کے صرف دو تین ایڈیشن بمبئی اور کانپور سے شائع ہوئے اور اب وہ بالکل کم یاب ہے البتہ برٹش میوزیم میں اس کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ تحسین کی "نو طرزِ مرصع" کو میر امن کی "باغ و بہار" سے کچھ نسبت نہیں تحسین میر امن کی طرح "دلی کے روڑے"

اور اردو کے دکھنی نہیں۔ ان کی زبان گنجلک اور تعقید سے بھری ہوئی ہے۔ اس پر انہوں نے بجائے فصیح اور سلیس اردو کے مرصع اور لچھے دار فقرے استعمال کیے ہیں اور عبارت آرائی میں بے حد تکلف سے کام لیا ہے اوّل تو کتاب قصہ کی اور پھر عوام الناس کے مطالعہ کے لیے ہو تو اس کی زبان ضرور سلیس و صاف ہونی چاہیئے۔ عبارت کی سادگی کو قصہ کی کامیابی میں بہت بڑا دخل ہے۔ تحسینؔ نے اس کی بدولت نثار ان اردو میں اپنی جگہ تو قائم کر لی مگر وہ ہرگز ان کی یادگار نہ بن سکی اور اس کی بدولت انہیں جو مقبولیت و شہرت ہونی چاہیئے تھی نہ ہو سکی ان کی کتاب افادۂ عام کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ نے میر امنؔ سے اس کو پھر مرتب کرایا۔

میر محمد علی خاں اورنگ آبادی المتخلص بہ شوقؔ نے بھی چہار درویش کو ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیان اردو میں نظم کیا ہے یہ دکھنی ترجمہ ہے اور دکھنی ادبیات میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ محمد عوض زرّیںؔ نے بھی چہار درویش کو نثر اردو میں لکھا ہے اس کا نام بھی "نو طرز مرصع" ہے اور یہ ایک عجیب الفاق ہے کہ اس کی تاریخ بھی زرّیںؔ نے "باغ و بہار" سے نکالی ہے۔

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار   لکھی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

عوض زرّین کی "نوطرز مرصع" میر امّن کی "باغ و بہار" کے ساتھ لکھی گئی ہے مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عوض زرّین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتداءً فارسی چہار درویش کو فارسی ہی میں مختصر کر کے اپنے مربی سیتل پرشاد کو دکھایا تو انھوں نے اس کو اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی اور ان کی فرمائش سے یہ اردو ترجمہ مرتب ہوا۔ اس میں سیدھی سادی عبارت میں چند قصّے بیان کر دیئے گئے ہیں۔ میر امّن کے پاس چاروں درویشوں کو جو مفصّل داستانیں ہیں وہ اس میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ ذیلی حکایتوں کے حذف کے بعد بیان ہوئی ہیں اس کا طرز بیان صاف اور بے تکلف ہے مگر میر امّن کے ترجمہ اور زبان کی خوبی مطلقاً نہیں اس کا ایک قدیم نسخہ ہمارے پیش نظر ہے مگر اس موقع پر اس کا کوئی نمونہ درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کے ترجموں میں اس قدر مغائرت ہے کہ مقابلہ کچھ زیادہ دلچسپ ثابت نہ ہوگا۔

میر امّن کی "باغ و بہار" کو جو بے انتہا مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ ان تمام نسخوں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکی اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا اس کے بعد سے اب تک بیسیوں ایڈیشن ہندوستانی اور انگریزی مطبعوں

سے شائع ہوئے۔ ایل ایف اسمتھ نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے جو پہلی مرتبہ کلکتہ ہی سے ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا۔ انگریزی ترجمے کے بھی متعدد ایڈیشن مدراس کلکتہ، لندن اور لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ اسمتھ کے علاوہ ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۷ء میں اس کا خلاصہ انگریزی میں طبع کرایا ہے۔ گارساں دی تاسی نے بھی فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۶۴ء میں پیرس میں ایک ایڈیشن شائع کیا۔ نیز غلام محمد خاں خلیبر نے "خریطۂ سرور" کے نام سے اس کو نظم میں منتقل کیا ہے غرض یہ کتاب اتنی مرتبہ چھاپی گئی کہ اگر اس کی تفصیل دی جائے تو دو چار صفحوں میں تمام ہو گی اس کے مقبول عام ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

باغ و بہار کی مقبولیت و شہرت کا اصلی راز اس کی زبان اور طرز بیان میں پنہاں ہے قصہ تو پہلے ہی شہرت حاصل کر چکا تھا اور میر امن سے پہلے اور بعد بہت سے لوگوں نے اس کو اپنے اپنے سلیقہ کے موافق اردو کا جامہ پہنایا مگر میر امن کے سوا آج کسی کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ میر امن نے اپنی کتاب میں ایسی سحر کاری کی ہے کہ وہی اب تک مقبول ہے اور جب تک اردو زبان زندہ ہے مقبول رہے گی اور اس کی قدر و قیمت میں مرور ایام کے ساتھ کوئی کمی نہ ہو گی میر امن خاص

دلی کے باشندے تھے۔ دہلی کی اردوئے معلیٰ ان کی زبان تھی "باغ و بہار" انہوں نے اسی ٹکسالی زبان میں لکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کا ذوق رکھنے والے جب کبھی ان کی کتاب پڑھتے ہیں تو چٹخارے لیتے ہیں اور ایک ایک جملہ اور فقرہ پر ان کی زبان سے واہ واہ نکلتی ہے اگرچہ میرامن کی زبان اب سے سوا سو سال پیشتر کی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر وہ آج کل کی زبان سے بھی بہت کچھ ملتی جلتی ہے اور باوجود اتنا زمانہ گزر جانے کے اس کی زبان میں کہنگی پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ کی بعض ترکیبیں بدل گئیں، بعض محاوروں کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے۔ بعض لفظ متروک اور بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں فرق پیدا ہو گیا۔ بعض ہندی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی لفظ داخل کیے گئے۔ تاہم یہ تبدیلیاں کچھ زیادہ اہم نہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوا سو برس کی مدت میں علمی اردو سے قطع نظر ٹکسالی اردو اور روزمرہ دہلی میں کوئی ایسی زبردست تبدیلی نہیں ہوئی جس کو انقلاب کہا جائے۔ فارسی زبان سے ابتداءً جو ترجمے اردو میں ہوئے تھے ان میں فارسی کے اتباع میں مضاف کو مضاف الیہ کے پہلے لایا جاتا تھا اور چونکہ ہندی کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ہندی الفاظ بکثرت اردو کتابوں میں رائج تھے مگر میرامن نے اپنے معاصرین

کے مقابلہ میں ہرگز اتنے زیادہ ہندی الفاظ استعمال نہیں کیے کہ کتاب کا سمجھنا مشکل ہو جائے۔ ان کی زبان کی غیر مانوس ترکیبوں اور متروک الفاظ وغیرہ کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

تباہی کھانا۔ یہ اس زمانہ کا مخصوص محاورہ ہے۔

وہ کی جمع وے۔ اب بالکل متروک ہے۔

امیروں کی جگہ امراؤں۔ یہ ترکیب بھی بالکل متروک ہے۔

بعض خالص ہندی الفاظ۔ چونچگی، اوگت، ندان وغیرہ اب یہ الفاظ اردو سے خارج ہو گئے ہیں۔

مضاف الیہ سے پہلے مضاف کا استعمال جیسے اقبال ان کا۔

فقروں کے بیچ میں جملہ معترضہ کا استعمال جیسے "جان گل کرسٹ صاحب" کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے۔ جب تک گنگا جمنا بہے، لطف سے فرمایا۔

خلوت کو مؤنث لکھا ہے مگر اب اس کو مذکر لکھتے ہیں۔

باغ و بہار کی زبان کے علاوہ طرز بیان میں بھی ایسی دلکشی اور دلفریبی ہے کہ قصوں کے طویل ہونے اور قصہ کے بیچ میں قصہ آجانے کے باوجود طبیعت اکتاتی نہیں اور جی یہی چاہتا ہے کہ کتاب ختم کیے بغیر نہ رکھی جائے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں کسی کے طرز بیان میں یہ دلکشی نہیں۔ اگر کسی کی زبان اور طرز بیان میر امن کے لگ بھگ ہو سکتا ہے تو وہ صرف

شیر علی افسوس ہیں۔ مگر ان کا طرز بیان بھی میر امّن کا سا سادہ اور پر لطف نہیں ہے۔

میر امّن کے طرز بیان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ محاورہ اور روزمرہ کے آگے قواعد زبان کی پابندی کی پروا نہیں کرتے بہادر علی اور میر امّن میں ایک خاص فرق یہی ہے کہ حسینی قواعد زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ان کے فقرے طولانی اور بے مزہ ہو جاتے ہیں مگر وہ آگے پیچھے کے دو چار لفظ محذوف کر کے قواعد کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے اور میر امّن اس کے برخلاف بول چال کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں اور حشو وزوائد کے حذف کرنے میں بڑی دریادلی سے کام لیتے ہیں۔ قصہ کی کتابوں میں اس کی سخت ضرورت ہے۔ قصہ اوّل تو کوئی ٹھوس علمی چیز نہیں ہوتا کہ اس میں نفس مضمون پر زیادہ نظر رکھی جائے اور زبان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی جائے علمی تصانیف میں البتہ یہ طرز بجھ نہیں سکتی۔ وہاں سنجیدگی کی ضرورت ہے اور جن لوگوں نے علمی اور تاریخی تصانیف میں بھی اس طرز کو برتنے کی کوشش کی وہ ناکام رہے اور وہاں ان کی یہ طرز بالکل بے موقع اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

قصوں اور افسانوں کا تعلق ادبیات لطیف سے ہے

اور ان کی زبان جتنی زیادہ سادہ صاف اور پرلطف ہو گی
اُتنی ہی ان کی لطافت زیادہ ہو گی اور وہ ادبیات لطیف
سمجھے جائیں گے۔ جن لوگوں نے اس گرُ کو بھلا دیا اور اس کی۔
پروانہ کی آج ان کے قصوں اور افسانوں کو گمنامی کا گوشہ
نصیب ہوا اور جن لوگوں نے اس پر کاربند ہو کر اپنے
قصوں کی رنگ آمیزی کی ہے وہ مقبول انام ہوئے اور
ان کے کارنامے ادبیات لطیف میں داخل ہیں۔

میر امن کے طرز بیان کی مقبولیت نے بہت سے مصنفین
میں ان کی تقلید کا شوق پیدا کیا ان میں مولانا نذیر احمد دہلوی
خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی "توبۃ النصوح"
میں "باغ و بہار"۔ کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور دونوں
کی زبان و بیان کا مقابلہ کیا جائے تو سوا سو برس میں جو
تبدیلیاں ہوئی ہیں ظاہر ہو جائیں گی اور یہ بھی معلوم ہو جا
یگا کہ ان دونوں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ مولانا نذیر
احمد کے مقلدین مولوی راشد الخیری و بشیر الدین احمد
دہلوی میں بھی میر امن کی طرز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ذیل میں باغ و بہار کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے
اس سے ان کے طرز بیان و زبان کی خصوصیات اور خوبیاں
ہویدا ہو جائیں گی۔

دسن اے عزیز! میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس اقلیم نیم روز کا ہوں۔ بادشاہ یعنے قبلہ گاہی نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور پنڈت جمع کیے۔ اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو اور جنم پتری درست کرو اور جو کچھ ہونا ہے حقیقت پل پل، گھڑی گھڑی اور پہر پہر، اور دن دن، مہینے مہینے، اور برس برس کی مفصل حضور میں عرض کرو بموجب حکم بادشاہ کے سب نے متفق ہو اپنے اپنے علم کی رو سے ٹھہرایا اور سادہ کر التماس کیا کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور سبھ لگن میں شہزادے کا تولد اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے کہ سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادل ہو اور جتنے علم و ہنر ہیں ان میں کامل ہو اور جس کام کی طرف دل اس کا مایل ہو وہ نجومی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جاویں۔ لیکن چودہ برس تک سورج اور چاند دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ وسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کے بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبرا وے اور جنگل میں نکل آوے

اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اس کا تقید رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پائے جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سکھ چین سے سلطنت کرے۔

یہ سن کر بادشاہ نے اسی لئے اس باغ کی بنا ڈالی۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔ اور مکان متعدد ہر ایک نقشے کے بنوائے میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اوپر ایک برج نمدے کا تیار کروایا تو دھوپ اور چاندنی اس میں سے چھنے۔ میں دائی دودھ پلائی اور انگا چھوچھو کر اور کئی خاصوں کے ساتھ اسی محافظت سے اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا اور ایک استاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے متعین کیا تو تعلیم ہر فن اور ہنر کی مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ خبر گیراں رہتے دم بدم کی کیفیت روزمرہ حضور میں عرض ہوتی ہیں اس مکان کو عالم دنیا جان کر کھلونوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں جو چاہتا سو

کھاتا۔ دس برس کی عمر تک جتنی صفتیں اور قابلیتیں
تھیں تحصیل کیں۔ (باغ و بہار صفحہ ۱۰۳)

قدیم قصوں کا مقصد صرف دل بہلائی ہی نہیں بلکہ اس کے ضمن میں خاص خاص چیزوں کی تعلیم دنیا بھی ہوتا تھا مگر تعلیم کا پیرایہ ایسا اختیار کیا جاتا تھا کہ قاری کی طبیعت ناصحانہ باتوں سے بیزار ہوئے بغیر بطور خود اس سے نصیحت حاصل کرلے۔ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کے مضامین پر ایک نظر باز گشت ڈالی جائے تو مصنف کی تعلیم ظاہر ہو جاتی تھی مثلاً بعض قدیم قصوں کا مقصد شہزادوں اور امیرزادوں کو رحم و انصاف سخاوت و فیاضی پر آمادہ کرنا، اوسط درجہ کے لوگوں کو تجارت اور سیر و سیاحت کا شوق دلانا۔ شادی کو کسی مشکل سوال کے حل کرنے پر منحصر قرار دینا ہوتا تھا کہ نوجوانوں میں جاں بازی و مبارز طلبی کا شوق پیدا ہو۔ "باغ و بہار" میں بھی اس قسم کی تعلیم دی گئی ہے۔ میرامن جو باتیں قارئین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر اٹل چیز ہے انسان اگر کسی شدنی کام کو روکنا چاہے اور اگر اس کا ہونا اس کو پہلے ہی سے معلوم بھی ہو جائے تو وہ ہرگز اس کو روک نہیں سکتا۔ جب اس شدنی امر کا وقت آئے گا وہ ہو کر رہے گا اور کوئی نہ کوئی غلطی ایسی سرزد ہو جائیگی

جس سے اس کے روکنے کی تمام تدابیر باطل ہو جائیں گی جس شخص کی قسمت میں جو بدا ہے اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی اس مسئلہ کی تائید ایک دو نہیں اکثر حکایات سے ہوتی ہے۔ مثلاً بصرہ کی شہزادی کو بادشاہ کا خفا ہو کر بالکل عسرت کے ساتھ نکال دینا اور اس کا از سر نو دولتمند بن جانا یا شہزادہ نیم روز کو لاکھوں جتن کے باوجود چودھویں سال کے اندر جنون ہو جانا۔

دوسری بات جو میرامن ناظرین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اس دنیا میں ظاہری انتظام کے علاوہ ایک مخفی اور باطنی انتظام بھی ہے۔ جب کسی انسان کو پے در پے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ ان سے تنگ آکر اپنے تئیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو کوئی بزرگ اور مقدس روح اس کی دستگیری کرتی اور اس کی مشکلات کا حل بتاتی ہے۔ جیسے ہر درویش کو حضرت مولا مشکل کشا ہلاکت سے بچاتے ہیں۔ مولف ناظرین کو تیسری بات یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم اپنے کیسے ہی اہم مقصد کی جستجو میں کیوں نہ مشغول ہو، اگر کوئی شخص تم سے زیادہ حاجت مند اور مضطرب ہے تو پہلے اس کا مطلب پورا کرنے میں اپنی ہمت صرف کر دو۔ مولف اس امر کو وضاحت سے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ کہ دنیا میں بادشاہت اور حکومت کے بعد اگر کوئی چیز انسان کو عمدہ حالت

میں رکھ سکتی ہے تو وہ تجارت ہی ہے اور تجارت بھی ایسی کہ ایک جگہ بیٹھ کر نہ کی جائے بلکہ وہ جس میں ملک ملک کی سیر و سیاحت اور عجائبات عالم کے مطالعہ کا موقع مل سکے۔ اس طرح کے عالمگیر مشاہدات سے زندگی کے نئے نئے طریقے معلوم ہوتے ہیں اور یہ عقل و علم کے بڑھانے کا نہایت مفید طریقہ ہے۔

قدیم قصوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قصہ کے بیچ میں دوسرا قصہ آجاتا ہے اس سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور مولف کا مقصد ناظرین کو تھوڑی دیر انتظار میں رکھ کر ان کی دلبستگی بڑھانا ہوتا ہے "باغ و بہار" میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً خواجہ سگ پرست کے قصہ میں ملکہ سراندیپ اور سوداگر آذربائیجان کے قصے آجاتے ہیں۔

قدیم داستان گو جب کسی میلے یا تماشے کا سین دکھاتے تو اس کے متعلق جتنے الفاظ اور اصطلاحیں ہوتی تھیں وہ سب ایک ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ یہ خصوصیت "باغ و بہار" میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً چوروں کی اقسام۔ خدمتگاروں کے مختلف درجے۔ دعوت کے لوازمات روشنی کا سامان۔ آتش بازی۔ کی چیزیں۔ خدمت گار عورتوں کے مختلف نام، ناچ اور گانے کی قسمیں وغیرہ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

"باغ و بہار" کے مطالعہ سے زمانہ قدیم کے طرز زندگی اور سماجی حالات کا بعینہٖ نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں بعض بادشاہ انتظام سلطنت اور صوبوں کی خبرگیری اور نگرانی کے لیے سال میں آٹھ مہینے دارالسلطنت سے باہر رہتے تھے اور بارش کا موسم پایۂ تخت میں گزارتے تھے شاہی محلوں میں مسلح عورتیں پہرہ دار ہوتی تھیں۔ اندر کا سارا انتظام ان کے سپرد ہوتا تھا ان کو قلماقنیاں اور اردا بیگنیاں کہتے تھے بادشاہ کے زیادہ معتبر ملازم حبشی غلام ہوتے تھے اور یہ لوگ عام طور پر وفادار سمجھے جاتے تھے خواجہ سرا شاہی زنانخانہ کے محرم راز ہوتے تھے۔ شہزادیاں ان کو اپنے اسرار سے آگاہ کرتی اور ان سے وقتاً فوقتاً اپنے کاموں میں مدد لیتی تھیں۔ وہ عام طور پر شہزادیوں سے بے تکلف ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ انائیں اور دائیاں بھی شہزادیوں کے رازوں سے واقف ہوتی تھیں اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھیں شہزادیوں پڑھی لکھی اور بہت سے مردانہ کمالات سے بہرہ اندوز ہوتی تھیں۔ باورچیخانہ کی نگرانی اکثر شہزادیوں کے سپرد ہوتی اور خصوصاً دعوت اور مہمانداری کے موقعوں پر کھانوں کی دیکھ بھال اور لوازمات کی ترتیب بذات خود کیا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ معمولی اور سادہ لباس زیب تن کرتی تھیں۔ شہزادیوں

اور اعلیٰ طبقہ کی امیرزادیوں میں پردہ کا کچھ رواج نہ تھا۔ وہ اپنی طرز معاشرت میں بہت کچھ آزاد ہوتی تھیں اور اپنی پسند کے موافق اپنے لیے شوہر انتخاب کرتی تھیں۔ عورتوں سے محلات میں جاسوسی کا بھی کام لیا جاتا تھا اور سنگین جرائم کے انکشاف اور خصوصاً محلات کے معاملات میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی۔

عام طور پر لوگ مہمان نواز ہوتے تھے۔ مسافروں اور مہمانوں کو تین دن تک اپنے ہاں اصرار سے رکھتے اور ان کی دل جوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا امیر طبقہ شراب سے محترز نہ تھا۔ گانے بجانے کی محفلیں بے تکلف ہوا کرتی تھیں اور گانے ناچنے والی لڑکیاں زرق برق لباس پہن کر محفلوں میں گاتی اور ناچتی تھیں اکثر میزبان اپنے بے تکلف مہمانوں کو محفل کی مناسبت سے جوڑا بدلواتے اور ہر امیر گھرانے میں ایسے موقعوں کے لیے متعدد پوشاکیں بنی رہتی تھیں اس زمانہ میں مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات نہایت پختہ تھے جب کبھی موقع ملتا سوداگر اور سیاح غیر مذہب والوں کو بے تکلف اپنے دین کی تلقین کرتے تھے۔ غیر قوم کی عورتوں سے شادی بیاہ کرنے اور انہیں اپنے مذہب میں شامل کرنے کا رواج بہت عام تھا۔ خاص و عام دونوں جادو اور نجوم

کے بڑے قائل تھے جب کسی امیر کے گھر بچہ پیدا ہوتا تو فوراً نجومیوں کو بلوا کر اس کا زائچہ بنوایا جاتا اور اس کی آیندہ زندگی کا حال دریافت ہوتا۔ نجومیوں کی ہدایات کے موافق بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی جاتی تھی۔ لاعلاج امراض میں انہی سے رجوع کیا جاتا اور اکثر طبیبوں کے ساتھ عامل اور سیانوں سے بھی مشورہ کیا جاتا اور ان کے حسب ہدایات گنڈے تعویز باندھے جانے اور صدقہ خیرات دی جاتی۔ غرض زندگی کے ہر اہم کام جیسے شادی بیاہ، تعمیر مکان سیر و سیاحت کے موقعوں پر عالموں سے مشورے لیے جاتے اور مبارک ساعت اور سبھ لگن دریافت کی جاتی۔ مسلمان سفر پر جاتے وقت امام ضامنؑ کا روپیہ بازو پر باندھتے اور سفر سے واپس آنے پر عورتیں تیل مالش اور ٹکے اتارتی تھیں۔ خارق عادت اور عجیب و غریب چیزوں سے بڑی دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ سادھوؤں اور تارک الدنیا درویشوں کے متعلق عام اعتقاد یہ تھا کہ وہ مشکلات و مصائب کے وقت دستگیری اور لاعلاج امراض کا علاج کرتے ہیں۔ کامل درویشوں کی نسبت یہ یقین تھا کہ کیسی ہی تیز ہوا چلے ان کا چراغ گل نہیں ہوتا۔

غرض "باغ و بہار" اس زمانہ کی طرز معاشرت، شادی

بیاہ، موت و حیات وغیرہ کے رسم و رواج اور عوام الناس کے معتقدات اور اوہام وغیرہ کا ایک صحیح مرقع ہے اور سماجی زندگی کے مظہر افسانوں میں اس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

گنج خوبی یہ میر امن کا دوسرا مگر بالکل غیر معروف کارنامہ ہے اس کا صرف نام ہی نام سنا جاتا تھا مگر کہیں اس کی تفصیل نظر سے نہیں گزری اور نہ یورپ کے کسی کتب خانہ میں اس کے قلمی یا مطبوعہ نسخے کا پتہ چلا حسن اتفاق سے ہمیں کتب خانہ آصفیہ میں ایک پرانا اور بوسیدہ نسخہ ۱۲۹۲ء کا مطبوعہ ملا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار کی تالیف کے بعد میر امن نے اس پر قلم اٹھایا۔ یہ بھی ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے لکھی گئی ہے۔ یہ ملا حسین الواعظ کاشفی کی شہرۂ آفاق کتاب "اخلاق محسنی" کا ترجمہ ہے ملا حسین کاشفی فارسی کے مشہور اور مقبول مصنف ہیں ان کی انوار سہیلی اور اخلاق محسنی سے ہر فارسی داں آشنا ہے۔ کاشفی نے تفسیر حسینی کے نام سے فارسی میں کلام اللہ کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ اخلاق محسنی اخلاقیات کی نہایت مقبول کتاب ہے اور میر امن نے اردو میں اس کا ترجمہ کر کے اردو کی نہایت عمدہ خدمت انجام دی ہے۔ اس کی تاریخ تالیف و نام کے متعلق خود ان کا بیان حسب ذیل ہے:-

"سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سے دو عیسوی کے "باغ و بہار" کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بس کہ جتنی خوبیاں انساں کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں اس واسطے اس کا نام "گنج خوبی" رکھا۔

میر امّن نے اس کے ترجمہ میں بھی جدت سے کام لیا ہے اور گو اس میں وہ آزادی نہیں برتی جو "باغ و بہار" میں ہے تاہم اس کا ترجمہ بھی نہایت آزاد ہے اور لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں خود لکھتے ہیں۔

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور روزمرہ نہ دیکھا اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورہ میں سارا احوال بیان کیا۔"

اس کتاب میں چونکہ اخلاقی نصائح اور ان کے ضمن میں حکایتیں دی ہیں اس لیے میر امّن نے بھی کتاب کی نوعیت کا لحاظ کر کے سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ روزمرہ کے ساتھ اخلاقی کتابوں کی متانت بھی باقی رکھی ہے اور یہی ایک خوبی ایسی ہے جس نے ان کو اس ترجمہ میں کامیاب بنایا۔ ذیل میں اس کا ایک مختصر سا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے اس

کتاب کی زبان اور طرزِ بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہنچایا کسو شخص نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہو مرنے کے بعد تم پر کیا گیا واردات گزری۔ اور اب کیا حال ہے۔ جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں اور سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب اور باعث ہے۔ کچھ تمہیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلے سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سایہ میں آن کر بیٹھا اس نے کوئی دم آرام پایا۔ جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی کہ اے بار الٰہا! اس مکان کے بنا کرنے

والے کے گناہ بخش اور اس کی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہ وہیں اس کی دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش ہوئی اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفہ میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت

ہرچند کہ سب کاموں میں غور کر دل ہوں   نیکی ہی بھلی سب میں اور باقی ہے سب بوچ

گنج خوبی مطبوعہ مطبع محبوب بمبئی سنہ ۱۲۹۲ء
ص ۱۸۱۸

سید حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف اور بہت مشہور اہل قلم ہیں ان کی ولادت دہلی میں ہوئی مگر سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے والد کا نام سید ابو الحسن ہے، ان کے آبا و اجداد زمانہ قدیم میں اپنے وطن نجف اشرف سے ہندوستان آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کی۔ ایک زمانہ دہلی میں گزارنے کے بعد گردش زمانہ نے سید ابو الحسن کو فکر معاش سے اس قدر تنگ کر دیا کہ انہیں بالآخر اپنے وطن دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہ لالہ سکھ دیو رائے کی معیت میں دہلی سے نکلے اور بنارس میں جا رہے۔

گو اس وقت دہلی کے باغ ادب میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی۔ پھر بھی خال خال لوگ ایسے موجود تھے جن پر دہلی کو بجا ناز تھا اور اس گئی گزری حالت میں بھی وہاں کے باکمال اور ارباب فن کا دم غنیمت تھا ان کی صحبتیں

اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے۔ حیدر بخش کے لیے دہلی کی سکونت کا ترک کرنا بہ ظاہر ایک بڑی بد قسمتی تھا۔ کیوں کہ دوسرے کسی شہر میں وہ عالمانہ صحبتیں اور علمی چرچے جو دہلی میں تھے مل نہیں سکتے تھے۔ مگر خدا کی عنایت شامل حال تھی کہ بنارس سے شہر میں بھی ان کو اعلیٰ ادبی تعلیم حاصل کرنے اور ارباب کمال کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔

اتفاق سے نواب علی ابراہیم خاں خلیل لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں بنارس کے ناظم عدالت مقرر ہوئے وہ پٹنہ کے باشندے تھے اور فارسی زبان پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے انھوں نے شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق پایا تھا اور اپنے زمانہ کے عمدہ اور ممتاز شعرا میں گنے جاتے تھے[۱]۔ بنارس میں ابوالحسن کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے لیے خوش نصیبی سے ایسا لائق شخص مل گیا۔ چنانچہ حیدر بخش ان کے سپرد کیے گئے ان کے فیض تربیت سے بہت جلد علوم متعارفہ میں مہارت بہم پہنچائی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیات کی باریکیوں اور شعر و شاعری کی لطافتوں سے بھی واقف ہونے کا موقع مل گیا۔ خلیل نے ان کو قاضی عبدالرشید نام ایک عالم کے تحت کسی خدمت

---

[۱] خلیل کا مفصل تذکرہ مرزا علی لطف کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

پر مامور بھی کر دیا۔ قاضی صاحب ایک عالم متبحر تھے ان کے تحت رہ کر حیدری نے بہت جلد عربی اور فارسی ادب پر عبور حاصل کر لیا اس کے علاوہ مذہبی علوم مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر و سیر کی تعلیم مولوی غلام حسین غازی پوری سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف علی ابراہیم خاں کے ماتحت عدالت میں کسی خدمت پر مامور تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے لیے ڈاکٹر گل کرسٹ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لائق اہل قلم اور اردو کے انشاپردازوں کو کلکتہ میں جمع کرنے لگے تو اس سلسلہ میں حیدری نے بھی کلکتہ کا رخ کیا اور تقریب سفر کے طور پر ایک کتاب "قصہ مہر و ماہ" کے نام سے مرتب کی اور اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کی خوبیٔ مطالب اور طرز بیان کی سلاست و صفائی کو بے حد پسند کیا اور حیدر بخش کو منشیان کالج کے زمرہ میں ملازم رکھ لیا۔ کالج میں ملازم ہونے کے بعد سے حیدر بخش ایک عرصہ تک فکر معاش سے آزاد ہو گئے اور خالص علمی زندگی شروع کی اور آخری دم تک تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔

حیدر بخش کے متعلق تذکرہ نویسوں نے کچھ بھی نہیں لکھا ہے ان کے معاصرین کے تذکرے بھی ان کے حالات سے خالی ہیں۔

البتہ عبد الغفور خاں نساخ[1] نے صرف اتنا ذکر کیا ہے "حیدری تخلص حیدر بخش دہلوی ۱۲۱۲ھ میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی آرائش محفل یعنی ہفت سیر حاتم نظر سے گزری" اور اس کے بعد ان کا یہ شعر نقل کر دیا ہے۔

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا[2] صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی سے ان کے حالات زندگی پردۂ خفا میں رہے۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خود ان کی تصانیف کے دیباچوں وغیرہ سے ماخوذ ہے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں کب تک ملازم رہے اور کس سنہ میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اتفاق سے تذکرہ ریاض الوفاق مولفہ ذوالفقار علی مست میں جو ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا ہے اور جس میں کلکتہ اور بنارس کے فارسی گو شعرا کے حالات بیان کیے گئے ہیں حیدری کے متعلق دو فقرے نظر پڑے۔ مست کا بیان ہے کہ "حیدری ۱۲۲۹ھ میں بنارس میں تھے اور وہ کچھ عرصہ تک فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر بخش ۱۲۲۹ھ سے بہت پہلے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اس کے

---

[1] سخن شعرا از نساخ ص ۲۷ [2] یہ شعر سودا کا ہے، دیکھیے آب حیات ص ۱۷۸ صرف دوسرے مصرع میں "طمانچہ" کی بجائے "تھپیڑا" ہے ۱۲

بعد وہ بنارس چلے گئے تھے جس کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان کی تاریخ وفات بھی صرف ایک زبانی بیان کی بنا پر ۱۸۲۳ء قرار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپر نگر نے منشی غلام حیدر کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ ان کے دوست حیدر بخش نے سنہ مذکور میں وفات پائی۔ منشی غلام حیدر، حیدر بخش کے دوست اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے چونکہ ان کے بیان کے علاوہ اور کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس وقت یہی سنہ قابل قبول ہے۔

اب ہم ان کے حالات سے قطع نظر کر کے ان کی تالیفات پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں ان کی دس گیارہ کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں انکی تعداد صرف تین ہے حیدر بخش حیدری نظم ونثر دونوں پر قدرت بلیغ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کلام کلیات یا دیوان کی صورت میں شایع نہیں ہوا ہے مگر متفرق طور پر جو نظمیں اور غزلیں دستیاب ہوئی ہیں ان سے ان جملہ کلام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی کوئی خاص خصوصیت نہیں کہ ہم ان کو اپنے زمانہ کے شعرا میں کسی ممتازانہ جگہ کا مستحق سمجھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام میں سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور سارے کلام میں ایک قسم کی ہمواری ہے کسی خاص صنف میں ان کا زور کلام بڑھا

ہوا اور دوسری صنف میں گھٹا ہوا انہیں پایا جاتا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت بھی شاعری کی بدولت نہیں ہے بلکہ ان کے نثری کارناموں نے انہیں اردو ادبیات میں ایک خاص رتبہ بخشا ہے ان کے یہی کارنامے اب اور آئندہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والے ہیں۔ ان کا دیوان تو شائع نہیں ہوا اور نہ ہمیں کوئی قلمی نسخہ حاصل ہو سکا مگر ان کی "گل مغفرت" میں بھی مرثیوں غزلوں اور نوحوں کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ ذیل میں اس سے تھوڑا سا کلام نمونۃً نقل کیا جاتا ہے۔

تیری فرقت میں زمین و آسماں نے رو دیا
سینہ و دل شق ہوئے روح رواں نے رو دیا

اے حسینؓ ابن علیؓ! کر یاد تیری تشنہ لبی
کوہ کی چھاتی پھٹی آب رواں نے رو دیا

کن فکاں قالب ہے تو اسمیں ہے جو روح سٹا
اس الم میں کیا کہوں میں کن فکاں نے رو دیا

کچھ ہمیں اہل زمیں ماتم نہیں کرتے ترا
سر دھنا رضواں نے اور باغ جناں نے رو دیا

دے بہا اے چشم تر ماتم میں اسکے خون دل
قدسیوں نے جسکے غم میں ہو پریشاں رو دیا

آدم و نوح و خلیل و موسیٰ و عیسیٰ نے آہ
غم کیا۔ جبرئیل حق کے راز داں نے رو دیا

اہل بیت مصطفےٰ یاں تک ہوئے گریہ کناں
سنگ خارہ بہہ چلا، ہر انس و جاں نے رو دیا

دیکھ کر رونا سکینہ کا کہوں کیا دوستو!
لڑکیوں نے غم کیا، ہر نوجواں نے رو دیا

حیدری آل عبا کی بے کسی پر کیا کہوں
دشت صحرا اجل بچھے کوہ گراں نے رو دیا

آج ہے دسویں محرم کی کہوں کیا ماجرا
سید اطہرؓ کا سر دشت بلا میں کٹ گیا

ہو گیا خورشید تاباں آج گردش سے سیاہ
دیکھ کر شبیر کا نوک سناں پر سر چڑھا

چرخ نے کر منہ پہ اپنے چادر ابر سیاہ — تشنگی شبیر کی کر یاد، خوں رونے لگا
بہہ گئے پانی ہو پربت شعلۂ شبیر سے — رہ گئے اس غم میں دریا اپنی آنکھیں ڈبڈبا
نے رکھے گلشن میں گل، نے بن رکھے خار و خس — خشک و تر اس آتشِ غم نے دیئے دونوں جلا

شہسوار لافتا ہو جس کا پا باگیا کہوں — ہے غضب! بیٹا ہی اس کا سر برہنہ پیادہ پا
آیت تطہیر جس کی شان میں نازل ہوئی وہ — اس کا کنبہ اونٹ پر بلوے میں سر ہے دکھلا
اہل بیت مصطفےٰ کو ظلم سے کر دیں تباہ — ہو غضب! کربل میں اسکو اشقیا دیویں جلا
کیا لکھوں آل عبا کا حال زار ایسے حیدریؔ — ہو گیا ٹکڑے جگر، منہ کو کلیجہ آ رہا

حیدر بخش کی غالباً پہلی تالیف "قصہ مہرو ماہ" ہے یہ کتاب انہوں نے اوائل ۱۲۱۱ھ میں لکھی اور اسی کو پیش کر کے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں باریاب اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے ان کی دوسری کتاب قصہ "لیلیٰ و مجنوں" ہے یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۲۱۴ھ میں تمام ہوا ہم کو یہ دونوں کتابیں نہ مل سکیں اس لیے ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں بیان کر سکتے۔

طوطا کہانی ان کی تیسری اور معرکۃ الآرا کتاب طوطا کہانی ہے۔ بعض قلمی نسخوں میں اس کو توتا کہانی بھی لکھا ہے۔ غالباً یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔ سنسکرت زبان میں زمانہ قدیم میں ایک کتاب "شکا سپ تتی" تصنیف ہوئی تھی شکا سپ تتی کے معنی "طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں ہیں۔ مسلمانوں نے

ہندوستان میں آباد ہو کر یہاں کی ادبیات اور دیگر علم و فن کی کتابوں کو اپنی زبان یعنی فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا اور سنسکرت اور ہندی کی بیسیوں کتابیں فارسی میں ترجمہ کر ڈالیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ بھی ہے اس کو اولاً مولانا ضیاء الدین نخشبی نے ۷۳۰ھ م ۱۳۳۰ء میں فارسی میں ترجمہ کیا نام طوطی بجائے ستر قصوں کے صرف باون قصوں کو لے لیا اور ان کے فارسی ترجمہ کا نام طوطی نامہ رکھا۔ مولانا ضیاء الدین نخشبی اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور فارسی کے بلند پایہ مصنف تھے ان کا وطن بدایون ہے اور وہ ۷۵۱ھ میں فوت ہوئے طوطی نامہ کے علاوہ سالک السلوک عشرہ مبشرہ کلیات و جزئیات ان کی مشہور و مقبول عام تصانیف ہیں[لے] مولانا نخشبی کے طوطی نامہ کی زبان نہایت مشکل اور ادق تھی مگر اس کے باوجود اس کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کے بعد فارسی ہی میں اس کے متعدد خلاصے ہوئے۔ ان میں سے دو خاص طور پر مشہور رہیں۔ ایک شیخ ابوالفضل کا جو دسویں صدی کے وسط میں لکھا گیا اور دوسرا ملا سید محمد قادری کا۔ آخر الذکر کے خلاصہ کو بھی بہت شہرت حاصل ہوئی اور حیدری نے جیسا کہ اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے اسی سے اردو ترجمہ کیا ہے۔ حیدری سے بہت پہلے کسی

لے اردوئے قدیم از مولوی سید شمس اللہ قادری حیدرآبادی ص ۱۱۵

شخص نے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا ۱۷۴۳ء میں اس خلاصہ کو دکھنی زبان میں ترجمہ کیا تھا اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں اور ایک برٹش میوزیم میں موجود ہے حیدری نے ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے طوطی نامہ کا ترجمہ کر کے اس کو طوطا کہانی کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم و شاگرد غلام حسین غازی پوری دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخنداں صاحب والا شان جان گل کرسٹ بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلہ کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بہ موجب فرمائش صاحب موصوف کے ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۱ء کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی کا ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔"

ملا محمد قادری نے مولانا نخشبی کے طوطی نامہ سے صرف (۳۵) قصوں کو انتخاب کر کے ان کا خلاصہ کیا تھا چنانچہ حیدری کی طوطا کہانی میں بھی اتنے ہی قصے ہیں طوطا کہانی کا ایک طویل اقتباس

سب سے پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ نے "بیاض ہندی" میں شایع کیا۔ پوری کتاب پہلی مرتبہ کالج کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۰۴ء میں شایع ہوئی اور کالج کے نصاب میں شریک کر لی گئی حیدری کے اس کارنامہ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن ہندوستان کے مختلف مطابع سے شایع ہو چکے ہیں۔ ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۳ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ لندن سے ایک خوشنما ایڈیشن شایع کیا تھا اس میں تین کتاب کے تمام اہم و مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہے علاوہ ازیں جی اسمال نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے:۔

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ با سینہ پرسوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے ہوئی جاتی ہوں اور ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔

فرد
نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا　　میں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہیے کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے۔ اور پشیمانی کھینچتا ہے جس طرح سے ایک شخص نے دوست کا کہنا نہ مانا اور پشیمان ہوا خجستہ نے کہا میرے اچھے طوطے میں تیرے صدقے وہ کونسی نقل ہے بیان کر۔

طوطا بولا کہ کسی شہر میں چار یار مالدار تھے اتفاقاً وہ
چاروں مفلس ہو کر ایک حکیم کے پاس گئے اور ہر ایک
نے اپنا اپنا احوال اس کے آگے ظاہر کیا۔ تب حکیم کو ان
کے اوپر رحم آیا اور ایک ایک مہرہ حکمت کا ان چاروں
کو دے کر کہا کہ یہ مہرہ ہر ایک اپنے اپنے سر پر رکھو اور
چلے جاؤ جس کے سر کا مہرہ جس جگہ گرے وہ اس کو
کھودے جو اس میں نکلے وہ اس کا حق ہے۔ آخر وہ
چاروں ہر ایک مہرہ اپنے سر پر رکھ کر ایک طرف کو
چلے جب کئی کوس گئے ایک کے سر کا مہرہ گرا اس نے
اس جگہ کو کھودا تو تانبا نکلا اس نے تینوں سے کہا
کہ میں اس تانبے کو سونے سے بہتر سمجھتا ہوں اگر
تمہارا جی چاہے تو میرے ساتھ یہاں رہو انہوں نے
اس کا کہنا نہ مانا اور آگے بڑھے تھوڑی دور گئے
تھے کہ وہ دوسرے کے سر کا مہرہ گرا اس نے جو زمین
کھودی تو روپیہ نکلا تب اس نے ان دونوں سے
کہا کہ تم ہمارے پاس رہو یہ روپیہ بہت ہے زندگی
گزر جائے گی اس کو اپنا ہی سمجھو انہوں نے اس کا
کہنا نہ مانا اور آگے بڑھے کہ تیسرے کے سر کا مہرہ گرا
اس نے بھی وہ زمین کھودی تو سونا نکلا تب

خوش ہو کر چوتھے سے کہنے لگا کہ اس سے اب کوئی چیز بہتر نہیں جانتے ہیں کہ اب ہم تم یہیں رہیں اس نے کہا کہ میں آگے جاؤنگا تو جواہر کی کان پاؤں گا یہاں کیا رہوں۔ یہ کہہ کر آگے چلا۔ قریب ایک کوس کے پہنچا تب اس کا بھی مہرہ گرا اسی طرح جو اس نے جگہ کھودی تو لوہا نکلا۔ یہ حالت دیکھ کر نہایت شرمندہ ہوا اور اپنے جی میں کہنے لگا کہ میں نے کیوں سونے کو چھوڑ کر اور اپنے یار کا کہنا نہ مانا سچ ہے۔

فرد سخن دوست کا جو نہیں مانتے ‌ ‌ ‌ ‌ وہ خاک پشیمانی ہیں چھانتے

(طوطا کہانی مطبوعہ نولکشور پریس ص ۳۸)

طوطی نامہ نخشبی کے دو منظوم ترجمے ملا غواصی اور ابن نشاطی نے دکھنی میں کیے تھے یہ دونوں اردو کے بہت ہی قدیم شاعر اور سلطنت قطب شاہیہ گولکنڈہ کے متوسل تھے۔ غواصی کا ترجمہ ۱۰۴۹ھ کا ہے اور ابن نشاطی کا ۱۰۶۷ھ میں مرتب ہوا ہے یہ دونوں ترجمے اردو شاعری کے ابتدائی نمونے ہیں۔ اور اس لحاظ سے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

آرائش محفل | حیدری کی دوسری مقبول اور مشہور کتاب "آرائش محفل" ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ

نے سخن شعرا میں اس کا نام ہفت سیر حاتم بھی لکھا ہے اس میں حاتم طائی سے متعلق قصص کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی سات سیریں بیان ہوئی ہیں۔ نساخ کا بتایا ہوا دوسرا نام بھی موافق موضوع ہے یہ قصہ ابتداءً فارسی نثر میں تھا اس کو حیدری نے اوائل ۱۲۱۶ھ م ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے سے اردو کا جامہ پہنایا ہے یہ فارسی نثر کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مترجم نے اپنی طرف سے بہت سی باتوں کا اضافہ کیا ہے اور اصل کتاب میں متعدد ردو بدل کر کے قصہ کو زیادہ پر لطف بنایا اور اپنا لیا ہے۔ آرایش محفل کو اس لحاظ سے ترجمہ کہنے کی بجائے حیدری کی تالیف کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "اس میں اپنی طبع کے موافق جہاں موقع پایا وہاں اور زیادہ کیا تاکہ قصہ طولانی ہو جائے سننے والے کو خوش آئے" مولف نے کتاب کے آخر میں حسب ذیل قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔

اس قطعہ پر لطف کے اتمام کی تاریخ — میں دل میں سمجھتا تھا نہایت ہی مشکل ہے
کر دور سرپاس کہا پیر خرد نے — کیوں کر نہ کہیں ہم اسے آرایش محفل
۱۲۱۶ھ

"آرائش محفل" تاریخ تالیف سے لے کر اب تک متعدد بار چھپ چکی ہے اور اس کے مقبول خاص و عام ہونے کی کافی دلیل ہے۔ آج کل دیگر قدیم قصص کی طرح اس کی طرف سے پبلک کی توجہ ہٹ

چکی ہے۔ مگر اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے اس نے اور اس کے ساتھ کی دوسری کتابوں نے ہی اردو میں سلیس و سادہ عبارت میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کرایا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال یہ کیا بھید ہے اور اس نے کیا نیکی کی ہے۔ اس کی خبر لا۔ اس شخص کے سنتے ہی حاتم اٹھ کھڑا ہوا اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ شخص کون ہے اور کس طرف کو رہتا ہے حسن بانو نے کہا میں نے اپنی دائی سے سنا ہے کہ اس کی جگہ اتر کی طرف ہے بس اتنی بات دریافت کر کے وہاں سے توکل بخدا چل نکلا۔ بعد ایک مدت کے کسی جنگل ہیبت ناک میں جا پہنچا اور شام کے وقت ایک درخت کے نیچے چپکا ہو کے بیٹھ رہا کہ اتنے میں ایک آواز سوزناک درد آلودہ ساتھ آہ وزاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کلیجا جلنے لگا بے اختیار اپنے جی میں کہہ اٹھا کہ اے حاتم یہ بات جواں مردی سے دور ہے کہ ایک

شخص بندۂ خدا کسی آفت میں گرفتار ہو کر رووے تو اس کی آواز سن کر مدد نہ کرے اور اس کا احوال نہ پوچھے اس کلام کو دل میں ٹھہرا کر اس طرف کا راستہ پکڑا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ اس جگہ جا پہنچا جہاں سے رونے کی آواز آتی تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک جوان خوبصورت سطح خاک پر بیٹھا گوہر اشک چشمۂ چشم سے اپنے گل رخسار نازنین پر بہا رہا ہے اور آہیں پرسوز بھر بھر کر یہ قطعہ پڑھتا ہے۔

قطعہ

جاؤں میں کہاں اور کہوں کس سے عزیز ٭ ٹک سے پوچھو تمہیں میرے دل زار کا احوال

جو مجھ پر گزرتی ہے رقم کر نہیں سکتا ٭ اور کہہ بھی نہیں سکتا زبان ہلکی سی لال،

حاتم نے کہا اے جوان دردمند ایسی کیا تجھ پر مشکل ہے جو اتنا حیران و پریشان ہے۔ اس نے کہا اے مسافر میں سوداگر ہوں اور یہاں سے بارہ کوس پر ایک شہر عالیشان ہے وہاں حارث نام ایک سوداگر نہایت عمدہ و مالدار رہتا ہے اور ایک لڑکی بھی پری پیکر رشک قمر رکھتا ہے اتفاقاً ایک دن میں کسی کسی طرف سے پھرتا پھراتا کچھ مال سوداگری کا لے کر اس شہر میں جا نکلا۔ حارث کی حویلی کے نیچے مارے دھوپ کے بیٹھ گیا۔ یکایک میری نظر کوٹھے کی طرف جو گئی تو ایک عورت نازنین مہ جبین نظر آئی۔ حالت میری

تباہ ہو گئی تب اس شہر کے لوگوں سے پوچھا میں نے یہ
کون ہے اور یہ کس کی حویلی ہے انہوں نے کہا کہ یہ
محل حارس کی بیٹی کا ہے اور وہ بڑا مالدار ہے میں
نے پھر ان سے کہا کہ یہ لڑکی شوہر رکھتی ہے یا نہیں
انہوں نے کہا کہ اس کا باپ اس کا بیاہ نہیں کر سکتا
اور اس کا کچھ بس اس بات میں نہیں چلتا۔ یہ لڑکی
اپنی شادی کرنے میں آپ مختار ہے اور یہ تین سوال
رکھتی ہے جو کوئی اس کے سوال پورے کریگا اسی
سے بیاہ کریگی۔ اس بات کے سنتے ہی میں اس کی
ڈیوڑھی پر گیا۔ دربان نے خبر کی۔ اس نے مجھے
اندر بلوایا اور ایک فرش پاکیزہ پر بٹھلا کر کہلا
بھیجا کہ اگر تو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے تو میں
اپنے سوالوں سے تجھے آگاہ کروں میں نے کہا
فرمایئے دل و جان سے قبول کیا اس نے کہا اگر
تو کہنا میرا کریگا تو میں تیری ہی ہو کر رہوں گی
اور جو یہ بھید نہ کھولیگا تو تجھے اپنا ہی جانونگی
میں نے اس کو قبول کیا اور قول دیا۔ تب اس نے
کہا پہلا سوال یہ ہے میرا کہ قریب اس شہر کے ایک
غار ہے وہاں آج تک کوئی نہیں گیا اور معلوم نہیں

کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے۔ دوسرا یہ کہ شب جمعہ کو
ایک آواز جنگل سے آتی ہے کہ نہ کیا وہ کام میں نے جو آج
کی شب کام آتا ہے میرے۔ تیسرے یہ ہے کہ وہ مہرہ جو سانپ
کی پیٹھ پر ہے مجھے لا دیوے۔ اس بات کے سنتے ہی
اور بھی رہے سہے حواس میرے گم ہو گئے۔ میں نے ٹک
ایک پانوں کھینچا اس نے دست تظلم سے میرا مال
و اسباب و زر و جواہر لوٹ لیا اور مجھ کو بھی اپنے شہر سے
نکال دیا۔ میں لاچار ہو کر اس جنگل میں آپڑا۔ ایک تو
مال گیا دوسرے رسوا ہوا۔ تیسرے عشق کے تیر نے
کلیجا چھلنی کر کے الا ہر اہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔
میں فقیر ہو گیا۔" (آرائش محفل)

ہفت پیکر حیدری نے حضرت نظامی گنجوی کی مشہور
فارسی مثنوی ہفت پیکر کی طرز پر اردو میں
ایک مثنوی اسی نام (یعنی "ہفت پیکر") سے تصنیف کی ہے یہ
سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق سنہ ۱۸۰۵ء میں تمام ہوئی۔ مرزا کاظم علی خاں جوان نے
اس کی تاریخ تصنیف اس مصرعہ سے نکالی ہے ع
جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی
جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ مثنوی شائع نہیں ہوئی۔ اس
مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں تھا۔ ہم کو اس

کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

تاریخ نادری حیدری نے "تاریخ نادری" کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے یہ تاریخی کتاب نادر شاہ کے خروج سے لے کر اس کے وفات ۱۱۶۰ھ تک کے مفصل حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور اس کو ابتداءً محمد مہدی ابن محمد نصیر استر آبادی نے فارسی میں تصنیف کیا تھا۔ مصنف نہ صرف نادر شاہ کا ہم عصر تھا بلکہ اس کا ملازم اور مقرب رہ چکا تھا اس نے اس میں جا بجا ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے اس کے مقرب ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس کتاب کا اصلی نام "تاریخ جہاں کشائے نادری" ہے مگر وہ عام طور پر تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے اور حیدری نے بھی اپنے اردو ترجمہ کے لئے یہی عرف عام پسند کیا اصل فارسی کتاب تو طہران، تبریز اور بمبئی سے شایع ہو چکی ہے مگر بد قسمتی سے اردو ترجمہ کو اشاعت و طباعت نصیب نہ ہو سکی۔ حیدری نے اس کا ترجمہ ۱۲۲۲ھ میں تمام کیا ہے یہ کتاب حیدری کا نہایت ہی قابل قدر کارنامہ ہے۔ اردو زبان کا دامن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی ایسی علمی اور اہم کتابوں سے بہت کچھ خالی ہے۔

گل مغفرت ملا حسین الواعظ کاشفی نے جن کی انوار سہیلی اور اخلاق محسنی سے ہر شخص واقف ہے شہداے

اسلام کے حالات پر ایک کتاب روضۃ الشہدا تصنیف کی تھی حیدری نے "گلشن شہیداں" کے نام سے اس کو اردو میں منتقل کیا پھر "گل مغفرت" کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا یہ کتاب صرف شہدائے کربلاؓ کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کو انہوں نے اپنے مذہبی اعتقادات اور محبت اہل بیتؓ کی بنا پر ۱۲۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کی تحریک پر ترتیب دیا ہے مگر اس میں اپنی طرف سے جا بجا نظم و نثر کے اضافے اس قدر کر دیے ہیں کہ گویا وہ ان کی مستقل تالیف بن گئی اس کی تاریخ تالیف اور وجہ تسمیہ خود انہوں نے اس طرح بیان کی ہے :-

"صاحبان درد و غم و مبتلایان رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں سے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب مولوی سید حسین علی صاحب جو نبوی زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچمدان کو ایک رسوخ دلی دنیاز باطنی ہے اس نسخہ وہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گل مغفرت" رکھا اس لیے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے مقبول خاطر ہووے بحق محمد و آلہ الامجاد ۔"

روضۃ الشہدا کی طرز پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں انہیں عموماً وہ مجلس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ عام طور پر عشرۂ محرم میں خوش عقیدہ مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر روزانہ دہ مجلس کا ایک حصہ سنا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ گل مغفرت کو بھی "دہ مجلس حیدری" کا نام دیا گیا مگر اس میں دس مجلسوں کی بجائے بارہ مجلسیں ہیں اور بارہویں مجلس میں تین اور ذیلی مجلسیں حضرت امام حسینؓ کے پھول، دسویں اور چالیسویں کی بھی ہیں حیدری محبت اہل بیت میں شرابور تھے اور "گل مغفرت" ان کی محبت اور جوش عقیدت کی ایک روشن دلیل ہے۔ شہادت کے واقعات بہت درد انگیز اور رقت آمیز طریقہ پہ بیان کرنے کے علاوہ ہر مجلس کے آخر میں ان بزرگ پر اپنی طرف سے ایک نوحہ لکھا ہے نیز جا بجا الم انگیز نظمیں۔ رباعیاں اور قطعے وغیرہ بھی دیے ہیں۔ مجالس ماو عزا کے لیے اردو میں بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں گل مغفرت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ طرز ادا اور صفائی بیان کے لحاظ سے اس کو شہادت کی بہت سی کتابوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس میں جو روایات بیان کی گئی ہیں ان کے متعلق اس وقت کچھ لکھنا ہمارے مبحث سے خارج ہے البتہ ہم اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ روایات کو درایت کے اصول پر نہیں جانچا گیا اور جوش عقیدت میں وہی روائتیں درج

کتاب کر لی گیئں جو عام طور پر مشہور رہیں۔ پھر بھی حیدری نے مولف "عناصر الشہادتین" کی طرح جا و بے جا روایات کا طومار نہیں باندھا بلکہ ہر چیز کے متعلق جو روایت معتبر و مقبول معلوم ہوئی اسی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ کتاب بہت بڑی حد تک بے جا زوائد سے پاک ہے۔

"گل مغفرت" ۱۲۲۷ھ م ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی اور محبان اہل بیت نے ہاتھوں ہاتھ لی۔ اس کے بعد دو تین اڈیشن اور شایع ہوئے ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ ہم کو اپنے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب حیدری کے کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے اور بمبئی کے مطبع حیدری ہی میں ۱۲۸۷ء میں چھپا ہے۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ باوجود سعی بلیغ کے کوئی اور نسخہ نہ مل سکا اور نہ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں ہی میں اس کے نسخے محفوظ ہیں۔ ایک فرانسیسی شخص برٹریا نامی نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شایع کیا تھا کتاب کا نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت کے ہوا خواہو۔ واے آل عبا کے ماتم دارو! ماہ محرم میں گریہ وزاری کرو خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو۔ حق تعالیٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجر عظیم دے گا بہشت بریں سا مکان عطا فرمائیگا

کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی ایک سو چھبیس سردار صاحب گرز شمار کیے گیے۔ عمرو لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رویا کہ غشق کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا اے بادشاہ تجھے کیا ہو گیا۔ ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا۔ اس نے کہا کہ اے وزیر نیک تدبیر۔ یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہدا کے ساتھ کربلائے معلی میں ہوتا تو ان کافروں بد نہادوں کو مارتا۔ آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کار چوبی ٹپکا کمر میں باندھے ہوئے حور و غلماں اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اور

بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے پوچھا اس نے کہا کہ اے شخص پہلے میں غضب الہٰی میں گرفتار ہوا تھا بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقہ سے بخشا گیا یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا اور آپ کا رنج والم یاد کر کے روئیگا یہ گریہ وزاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی۔ موجب نجات کا ہوگا۔"

(ص ۱۳۷ گل مغفرت)

گلزار دانش حیدری کا ایک اور کارنامہ "گلزار دانش" ہے یہ شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب "بہار دانش" کا اردو ترجمہ ہے۔ ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا اور نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ حیدری نے یہ ترجمہ کس سنہ میں تمام کیا۔ عنایت اللہ کی بہار دانش کئی سو صفحات کا ایک نیم تاریخی قصہ ہے اور اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقہ اور جہاندار شاہ کی مہموں اور مبارزطلبیوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۱ھ ہے اور مولف نے دیباچہ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ یہ قصہ اس کی اپنی ایجاد یا اختراع پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس نے کسی نوجوان برہمن کی زبانی یہ حسن و عشق کی کہانی سنی تھی جس کو اس نے فارسی

میں تالیف کر دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل فارسی تالیف کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ بھی مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے حاصل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ حیدری کا ترجمہ نہیں ملا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ طبع نہیں ہوا۔ حیدری کے بعض دوسرے کارناموں کی طرح اس کو کچھ زیادہ شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں ممکن ہے کہ کسی کے خانگی کتاب خانہ میں اس کا ایک آدھ نسخہ محفوظ ہو۔ بہار دانش کو مرزا جان طپش نے مثنوی سحر البیان کی طرز پر اردو میں منظوم کیا ہے اور یہ مثنوی شایع اور مقبول ہو چکی ہے اس کا مفصل ذکر طپش کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔

گلدستہ حیدری

حیدری نے مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ "گلدستہ حیدری" کے نام سے اپنے متفرق مضامین دیباچوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ۱۲۱۷ھ میں مرتب کیا تھا اس کی تاریخ تدوین "بناتا ذہ گلدستۂ حیدری" سے نکلتی ہے۔ یہ گلدستہ بھی زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اور صرف قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے بہ تفصیل ذیل پانچ حصے ہیں۔

(۱)، مجموعہ مراثی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام و دیگر شہدائے

کربلاؓ کی شہادت پر درد ناک مرثیے جو مختلف اوقات میں کہے گئے ہیں ان کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

صلوٰت بھیجتا ہوں میں اب اس امام پر جس نے کہ سر کٹا دیا امت کے کام پر

(۲) مجموعۂ حکایات۔ اس میں اپنے حالات زندگی۔ اور سو سے زیادہ لطیفے اور قصے لکھے ہیں۔

(۳) قصۂ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

(۴) قصۂ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ۔

(۵) دیوان غزلیات جس میں غزلوں کے علاوہ قطعے قصیدے ہجو یہ اور دیگر متفرق نظمیں شامل ہیں۔

گلدستۂ حیدری کے بعض نسخوں میں ان پانچ حصوں کے علاوہ ایک اور چھٹا حصہ بھی ہے جو اردو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن یہ ایک علیٰحدہ اور مستقل کتاب ہے اس لیے ذیل میں اس کا ذکر علیٰحدہ عنوان سے کیا جاتا ہے۔

گلشن ہند مرزا علی لطفؔ کا تذکرہ جو اسی نام سے لکھا گیا شایع اور مشہور ہے اس کا تفصیلی بیان ہم نے ان کے حالات میں کیا ہے یہاں اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں مگر بدقسمتی سے حیدریؔ کا یہ تذکرہ نہ اب تک شایع ہی ہوا اور نہ کسی نے اس پر روشنی ڈالی ہے یہ اب تک پردۂ خفا میں رہا۔ حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق۔ لطفؔ اور حیدری

دونوں نے اپنے تذکرہ کا نام "گلشن ہند" رکھا ہے اور دونوں تذکرے نہ صرف ایک ہی زمانہ بلکہ ایک دو سال کی تقدیم و تاخیر سے تالیف ہوئے ہیں۔ ہمارا ...... خیال ہے کہ حیدر بخش حیدری نے اپنے اس کارنامہ کو کچھ زیادہ قابل قدر نہیں سمجھا اور اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کے آگے پیش نہیں کیا۔ ورنہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹر گل کرسٹ ایسی عمدہ تالیف کی قدر نہ کرتے اور اس کو کالج کی طرف سے شایع نہ کرتے۔ اُردو شاعروں کے متداول اور مشہور تذکروں کی مشکلات و بے ربطی کی وجہ سے انہوں نے لطف جیسے پر تکلف اور شاعرانہ نثر لکھنے والے سے تذکرہ لکھوایا تو ممکن نہ تھا کہ وہ حیدری کے تذکرہ کی قدر نہ کرتے خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ حیدری صاف و شستہ زبان لکھنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے اور خود فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ بہر حال یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے خود اس کی قدر نہ جانی اور اس کی نظر ثانی اور طباعت کا خیال نہ کیا۔

اس تذکرہ کی تقریب تالیف حیدری نے بیان کی ہے کہ وہ کشتی میں سوار ہو کر بنارس سے ۲۱ رجب ۱۲۱۴ھ کو مرشد آباد آئے اور غالبًا وہاں سے کلکتہ کا ارادہ رکھتے تھے کہ راہ میں غازی پور کے قریب ان کے ایک قدیم دوست

مرزا احمد علی دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں اتفاق سے ایک راہ جا رہے تھے۔ مرزائے موصوف شاعری کا بے حد ذوق رکھتے تھے اور سفر میں بھی ان کے ساتھ کئی ایک شعرائے اُردو کے دیوان موجود تھے انہوں نے حیدرؔی کو تذکرہ لکھنے کا مشورہ دیا اور اس میں اتنی دلچسپی لی کہ اپنے ساتھ جتنے دیوان تھے ان کے سپرد کیے اور بہ اصرار تمام ان کو اس کام پر آمادہ کیا۔ اور ان کی تحریک و ترغیب سے یہ تذکرہ تمام ہوا۔ اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۴ھ ہے اور ذیل کے قطعہ سے بھی جو کتاب کے آخر میں درج ہے نکلتی ہے۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ۔۔۔ ز روئے حق یہ بولے شیخ اور ند
کہی تاریخ اس کی حیدرؔی خوب ۔۔۔ اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند

لطفؔ نے اپنے تذکرہ میں دیباچہ کے بعد یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا ۔۔۔ کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلشت ہے
حیراں پھرے ہیں بے سروپا ہمن اور نے ۔۔۔ تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہے

"رشکِ بہشت" کے اعداد (۱۲۲۷) میں "جب" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ حیدرؔی کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "زینت کلام کی اس آفریدگار کی حمد سے ہے کہ جس نے سخن روح افزا کو ہر ایک بشر کی زبان پر جاری کیا"

لہ ۱۲۰۶ + ۸ = ۱۲۱۴ھ۔

لطف کا تذکرہ اس طرح شروع ہوا ہے "رعنائی اور دیبائی دلبران سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے جس نے معشوقانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا" دونوں تذکروں میں حروف ہجی کی ترتیب پر شعراء کا حال بیان ہوا ہے چنانچہ دونوں میں سب سے پہلے شاہ عالم بادشاہ آفتاب تخلص کا ذکر ہے۔ لطف نے اس طرح لکھا ہے "آفتاب تخلص، نور ریز جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شہزادگی میں گوہر صدف سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔" مگر حیدری نے ان الفاظ سے ابتدا کی ہے۔ "مہر منیر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ عالمگیر ثانی"

آکسفورڈ یونیورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں حیدری کے تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے اپنی مرتبہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے نیز برٹش میوزیم میں ایک نامکمل نسخہ ہے جس کا ذکر مسٹر بلوم ہارٹ ماسوق علیہ سابق پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ لندن نے فہرست مخطوطات میں لکھا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے بعض خانگی کتاب خانوں اور قدیم ذخائر علم و ادب میں بھی اس کا ایک آدھ نسخہ ہو۔ کیا اچھا ہو گا اگر لطف کے گلشن ہند کی طرح حیدری کا تذکرہ بھی دستیاب اور پھر زیور طبع سے آراستہ ہو

جائے یہ اُردو تذکروں میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ ہر دو شخصوں کے نقاط نظر میں جو فرق ہوتا ہے اس کے لحاظ سے ان دونوں معاصر اہل قلم کی ایک ہی موضوع کی دو کتابوں کا مطالعہ جیسا کچھ دلچسپ ہوگا ظاہر ہے ایک طرف لطفؔ کا پر تکلف اور پیچدار طرز بیان اور دوسری طرف حیدریؔ کی صاف و شستہ زبان کا لطف اٹھانے کا اچھا موقع حاصل ہوگا۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے شفیق دوست ڈاکٹر زورؔ نے برٹش میوزیم کے نسخہ سے نقل کر کے ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم ان کے بیحد ممنون ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدریؔ کا تذکرہ ان کے حسب دل خواہ مرتب نہ ہو سکا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے .... ان کو اس کی نظر ثانی اور دوبارہ تدوین و ترتیب کا موقع نہیں ملا۔

"افسوس تخلص" نام میر شیر علی اور اُن کے والد بزرگ کا نام مظہر علی خاں ہم جلیس میر حیدر علی خاں حیرآن بالفعل مند حیات پر موجود ہیں اور شعر اس طرح کہتے ہیں۔

بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں
چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

سوداؔ تخلص نام میرزا محمد رفیع ساکن دلی فخر شعرائے ہندوستان طبع عالی رکھتے تھے یہ اُن سے ہے۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹا شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ما حوال موتّف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام معہ اشعار و تخلص کے جمع کیے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ وہ جز حرف شین سے لے کر حرف ی خدا جانے کیا ہوئے اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اس صورت سے قدر سے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام و اہبیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی کہ دستگیر درماندگان ... اور حامی بےکساں ہے اللہ و تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اُسے اور مشکل کشائی اُس کی مشکل کشا کیا کرے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد"

(تذکرہ گلشن ہند قلمی برٹش میوزیم)

ہم کو حیدری کی جو مولفات دستیاب ہوئی ہیں اور جن کے نمونے ہم نے اوپر نقل کر دیے ہیں ان پہ ایک سرسری... لظر ڈالنے سے حیدری کے طرز بیان کی خصوصیات اور اس کے محاسن و مصائب آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں فورٹ ولیم

کالج کے اکثر ارباب قلم کی طرح وہ نہایت سادہ و صاف زبان لکھتے ہیں میر امّن کا رجحان روزمرّہ اور محاوروں کی طرف ہے وہ محاورہ اور دلّی کی مخصوص بولی سے اِدھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے اور ان کے ہاں ہندی الفاظ کا خاصا استعمال ہوا ہے اس کے برخلاف حیدری محاوروں کی طرف متوجہ نہیں ان کا میلان طبع صفائی اور شستگی کی طرف ہے۔ ان کی تحریر میں عربی فارسی کے الفاظ بکثرت ہیں۔ ابتدائی نثر میں تو جیسا کہ طوطا کہانی کے نمونہ سے ظاہر ہے فارسی ترکیبیں زیادہ ہیں اور ساری کتاب پر فارسیت کا اثر چھایا ہوا ہے مگر بعد میں یہ اکثر کم ہوتا جاتا ہے اور آرائش محفل جہاں.... انہوں نے آزادی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اور اپنی جولانی طبع سے فارسی مضمون کو اردو میں پیرایہ بدل کر پیش کرتے ہیں ان کا قلم سیدھی سادی اور سلیس عبارت لکھتے لگتا ہے میر امّن کی باغ و بہار میں جو رنگینی اور بانکپن ہے وہ انہی کی حد تک محدود ہے۔ حیدری کے طرز بیان میں سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں پایا مگر لطف یہ ہے کہ گھلاوٹ سے بھی خالی نہیں ان کے جملہ اکثر طویل ہوتے ہیں حرف عطف و کاف صلہ کا کافی التزام ہے قواعد زبان کی پابندی میں جملوں کی ترخیم پسند نہیں کرتے مگر اس کے باوجود بھی گنجلک

اور تعقید نہیں۔ اس زمانے میں عام طور پر فارسی کی طرح مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد لایا جاتا تھا یہ محض فارسی سے ترجمہ کرنے کا اثر تھا اور اس عہد کے تقریباً تمام اہل قلم ایسا ہی لکھتے تھے لیکن حیدری کی عبارتوں میں بہت ہی کم جگہ یہ بات نظر آتی ہے ان کی نثر حال کی نثر سے قریب معلوم ہوتی ہے۔

میر شیر علی افسوسؔ

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر شیر علی افسوسؔ اپنے ترجمہ گلستان کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔ افسوسؔ، سیّد علی مظفر خان کے بیٹے اور سیّد غلام مصطفےٰ خاں کے پوتے تھے ان کے ایک اجداد خاف[1] کے رہنے والے اور حضرت امام جعفر صادق رضؓ کی اولاد سے تھے ان کے ایک جدا علیٰ سیّد بدرالدین اور ان کے بھائی سیّد عالم الدین حاجی خافی ابتداءً ہندوستان آئے اور آگرہ کے قریب قصبۂ نارنول میں توطن اختیار کیا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہدِ حکومت (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) میں افسوسؔ کے دادا اپنے دونوں بیٹوں سیّد علی مظفر خاں و سیّد غلام علی خاں کو لے کر دہلی آئے اور تینوں نے نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی ملازمت اختیار کی اسی زمانے میں شیر علی افسوسؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنِ ولادت معلوم نہیں مگر ان کی پیدائش ۱۷۳۵ء سے دو تین

---

[1] باغِ اُردو کے ایک قدیم قلمی اور ایک مطبوعہ نسخہ میں قاف کو خاف لکھا ہے ۱۲

سال قبل کی ہو گی۔ کیوں کہ خود افسوس نے لکھا ہے کہ نواب عمدۃ الملک کی وفات کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاش معاش میں نکلے تو اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ عمدۃ الملک نے ۱۷۴۶ء میں انتقال کیا اس لحاظ افسوس کی ولادت ۱۷۳۵ء سے قبل ہونی چاہئے۔

افسوس کے والد اور چچا دونوں ایک عرصہ تک عمدۃ الملک کے ساتھ رہے خصوصاً سیّد علی خاں اپنی کارکردگی و معاملہ فہمی کی بدولت بہت جلد صاحب اقتدار ہو گئے اور جب ۱۷۴۶ء میں۔ عمدۃ الملک نے وفات پائی تو وہی منصرمانہ طور پر صوبۂ الہ آباد کے نائب بنا دیے گئے۔ اِدھر محمد شاہ کی سلطنت درہم برہم ہوئی اور عمدۃ الملک نے بھی وفات پائی اور اِدھر چند روز بعد غلام علی خاں بھی راہی ملک عدم ہوئے نہ اگلا سا زمانہ رہا نہ پہلے سے مربی۔ علی مظفر خاں ترک ملازمت کر کے چند سال خانہ نشیں رہے اس کے بعد قاسم علی خاں نواب بنگالہ کے پایۂ تخت پٹنہ کا رخ کیا اور یہاں پہنچ کر اس کے ہاں ملازم اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ میر قاسم علی خاں کے انتقال کے بعد اس کے جانشین جعفر علی خاں کی ماتحتی میں اس خدمت کے علاوہ اور بھی کسی عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۷۶۰ء میں اس کے معزول ہونے تک اسی کے متوسل رہے جس وقت

افسوس کے والد نے پٹنہ کا رخ کیا افسوس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی اور گلستاں پڑھتے تھے وہ خود لکھتے ہیں "سیر دیوان ولی کی اکثر کرتا طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی۔ چنانچہ کئی شعر اوقاتِ مذکورہ میں بہ وضع قدما کہے تھے۔ یہ مطلع انہی میں سے ہے۔ بیت

اے پیاری ترے اس حسن نگیں کا خدا حافظ ‌ ‌ ‌ ‌ نری اس زلفِ پرچیں کا محمد مصطفےٰ حافظ

علی مظفر خاں جعفر علی خاں حاکم بنگالہ کی معزولی کے بعد پٹنہ سے نکل کر نواب خانِ عالم بقاء اللہ خاں کی وساطت سے نواب شجاع الدولہ والی اودھ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء) کی سرکار میں تین سو روپیہ کے ملازم ہوئے لیکن تین چار سال لکھنؤ میں رہنے کے بعد جب وہ ملازمت کچھ دیر پا نظر نہ آئی تو دکن کا رخ کیا اور حیدرآباد پہنچے کئی سال حیدرآباد میں رہ کر وہیں انتقال کیا۔

افسوس اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے بھتیجے نواب سالار جنگ کے ہاں ملازم ہو چکے تھے اور ان کے بیٹے میر نوازش علی خاں المخاطب بہ سرفراز جنگ کی اتالیقی کی خدمت ان کے سپرد تھی۔ افسوس نے اپنا دیوان سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا سالار جنگ کی وفات کے بعد سرفراز جنگ نے بھی اپنے حوصلہ کے موافق ان کی قدردانی کی۔ ان دنوں مرزا جوان بخت جہاندار

شاہ ولیعہد سلطنت مغلیہ لکھنؤ میں رونق افروز تھے انہوں نے جب افسوس کا کلام سنا تو از راہ قدر دانی طلب کر کے اپنے مصاحبوں میں شریک کر لیا۔ افسوس نے اس فراغت و بیفکری کے زمانہ میں عربی کی تحصیل کی کتب متداولہ پر کافی عبور حاصل کر لیا۔

لکھنؤ اس زمانہ میں شعراء، علما و فضلا کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، جراءت اور انشاء وغیرہ شعرا کی صحبتوں میں افسوس کے ذوق شعر گوئی کو خوب ترقی ہوئی اکثر ان اساتذہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور تحسین و آفرین کا صلہ حاصل کرتے تھے۔ مرزا جوان بخت کو بھی افسوس کا کلام بہت پسند آیا اور انہوں نے ان کو اپنی بزم کا شاعر بنا لیا افسوس کا یہ زمانہ نہایت فراغت اور لطف کے ساتھ گزرا۔ جب شہزادہ جواں بخت نے دہلی کا ارادہ کیا تو افسوس کو بھی لیجانا چاہا مگر افسوس نے لکھنؤ کی پر لطف صحبتیں چھوڑ کر اجڑی ہوئی دلی جانا پسند نہ کیا۔ اور معذرت کر کے شہزادہ جوان بخت کے بعد یہیں رہے۔ نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے نائب حسن رضا خاں المخاطب بہ سرفراز الدولہ نے افسوس کی سرپرستی کی اور اپنی مصاحبت و ہمراہی میں رکھ کر فکر معاش سے مستغنی کر دیا۔ یہ سرفراز الدولہ

وہی ہیں جن کی مزار رفیع سوداؔ نے مدح سرائی کی ہے کلیات سودا میں دو قصیدے ان کی مدح میں موجود ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں :-

صباح عید ہے اور یہ سخن ہی شہرۂ عام | حلال دُختر رز بے نکاح و روزہ حرام
عزیز عقل کو سوداؔ کی تھی جدائی شاق | سو اس کنھ وہ پھر آیا ہی بس کہ تھا مشتاق

افسوسؔ نے ان دنوں شاعری کا مشغلہ قریب قریب ترک کر دیا تھا اور ان کا شغل درس و تدریس تھا۔

انہی ایام میں انگریز حکام کو فورٹ ولیم کالج کے لیے لائق منشیوں کی ضرورت داعی ہوئی اور وہ ان کی تلاش و انتخاب کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں میر تقی میرؔ سے ملازمت کی خواہش کی گئی مگر خوددار سرتاج شعرا اُردو میرے نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۱ء میں کرنل اسکاٹ سے افسوسؔ کا تعارف کرایا اور ان کی فضیلت علمی اور کلام کی بے حد تعریف کی۔ کرنل اسکاٹ کلام سن کر بے حد محظوظ ہوئے اور فی الفور ان کا انتخاب کر کے کلکتہ بھیجدیا افسوسؔ نے جیسا کہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے۔ قدیم طرز کی شاعری سے اُکتا کر فکر سخن ترک کر دی تھی اور درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے تھے نیز لکھنؤ کے معاشرتی و اقتصادی حالات نے لکھنؤ سے ان کی دل بستگی اٹھا دی اس لیے "صاحبان عالیشان" کی نوکری

کو غنیمت سمجھا اور رسید ھے کلکتہ کی راہ لی۔ کلکتہ میں ڈاکٹر گل کرسٹ نے ان کی قابلیت کا اعتراف کر کے دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر تصنیف و تالیف کے لیے ان کا تقرر کیا افسوسؔ نے کلکتہ میں کوئی آٹھ نو سال تصنیف و تالیف کا کام کر کے ۱۸۰۹ء میں وفات پائی۔ بیلؔ نے اپنی کتاب[1] میں افسوس کا سنہ وفات ۱۸۰۶ء بتایا ہے۔ گارساں دی تاسی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ۱۸۰۶ء لکھا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

مرزا علی لطفؔ مولف تذکرۂ گلشن ہند افسوسؔ کے نہ صرف معاصر بلکہ قدیمی دوست تھے انھوں نے اپنے تذکرہ میں ان کا کسی قدر تفصیلی حال لکھا ہے مگر تاریخ ولادت ان کے ہاں بھی نہیں افسوسؔ نے لکھنؤ سے نکل کر پہلے مرشد آباد میں مرزا علی لطفؔ کے ہاں چند روز قیام کیا اور ان سے بھی کلکتہ آنے کا وعدہ لیا۔ اغلب ہے کہ مرزا علی لطف انھی کے ایما سے کلکتہ آئے۔ اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ لطفؔ نے افسوسؔ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی خوش اخلاقی اور عملی فضائل کے متعلق اپنی حسب ذیل رائے لکھتے ہیں "فی الحقیقت کہ ذات ان کے زمانہ کے انتخاب سے ہے۔ عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکسار میں فرد کامل ہیں۔ منطق

---

[1] بیوگرافیکل ڈکشنری از بیل طبع دوم

و معافی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں کلیات و معالجات فنِ طبابت کے بھی بخوبی ماہر ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں اقسام نظم میں۔"

قیام کلکتہ کے زمانہ میں افسوس نے دو کتابیں مرتب کی ہیں ایک "باغ اردو" اور دوسری آرائش محفل"۔ اس کے علاوہ تصحیح اور نظر ثانی کا بہت سا کام انجام دیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی اب ہم بہ لحاظ تاریخ ان کی تالیفات کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

دیوان

افسوس نے اپنا دیوان لکھنؤ میں سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا اس لحاظ سے وہ ان کا پہلا کارنامہ ہے۔ نساخ نے لکھا ہے کہ شاعری میں افسوس کو میر حیدر علی حیرانؔ اور میر سوز سے تلمذ حاصل تھا صاحب تذکرہ گلشن ہند جو افسوس کے معاصر اور دوست تھے ان کے تلمذ کے متعلق لکھتے ہیں "اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیرانؔ تخلص سے ہوا۔ اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسنؔ تخلص کا لکھا ہے اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی"۔ مصحفی نے بھی اپنے تذکرۂ ہندی میں ان کو حیرانؔ اور میر سوز کا شاگرد بتایا ہے۔ افسوس کا دیوان جملہ اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ عام دواوین کی طرح حروف ابجی پر ترتیب

دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قصاید کا مجموعہ ہے ان میں اکثر قصیدے آنحضرت صلعم کی تعریف میں ہیں۔ باقی نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) اور مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل ہند (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) کی مدح میں ہیں اس کے بعد چند سلام اور مرثیے ہیں۔ دیوان کا دوسرا حصہ غزلیات کا ہے جس کے حرف تہجی کی ترتیب پر غزلیں ہیں غزلیات کے بعد مخمسات، رباعیات ایک ترکیب بند اور ایک واسوخت ہے اور آخر میں گیارہ قطعات کا مجموعہ ہے جس میں سے پہلے تین قطعے شہزادہ جوان بخت مرزا جہاندار شاہ کی شادی سفر شکار اور تہنیت عید کے متعلق ہیں۔ باقی آٹھ قطعوں میں مارکوئس ویلزلی اور فورٹ ولیم کالج کے بعض پروفیسروں کی مدح ہے۔ ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ افسوس کا "دیوان کن مطابع سے شایع ہوا ہے۔

برٹش میوزیم میں "دیوان افسوس" کا ایک بہت ہی قدیم نسخہ ہے جو ہر طرح مکمل اور صحیح معلوم ہوتا ہے اس میں جملہ اصناف کا کلام مذکورہ بالا ترتیب پر دیا ہوا ہے اور قصائد سے پہلے فارسی میں بطور مقدمہ افسوس کے حالات بھی لکھے ہیں۔ حالات تقریباً وہی ہیں جو خود افسوس نے اپنی "باغ اردو" میں لکھے ہیں یہ مقدمہ میر حیدر بلگرامی کا قلمی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آرائش محفل کی تالیف ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء سے قبل کا ہے کیوں کہ اس میں

افسوسؔ کی اس تالیف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں بھی ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس کا خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے اور کسی قدر نامکمل معلوم ہوتا ہے۔

علامہ سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر نے ۱۹۰۳ء میں "مختار اشعار" کے نام سے انتخاب شعرائے اردو کا ایک سلسلہ مدراس یونیورسٹی کے لیے ترتیب دیا تھا اس سلسلہ میں میر تقی، سودا، میر سوز، قایم چاندپوری کے ساتھ افسوس کا کلام بھی شایع ہوا ہے یہ انتخاب بہت مقبول ہوا اور ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے ایڈیشن شایع ہوئے ہیں۔ حکیم محمد علی عرشیؔ نے اس کا ایک مشرح ایڈیشن بھی مطبع قاسمی حیدرآباد سے شایع کیا تھا۔ افسوسؔ کی عاشقانہ شاعری قدیم اساتذہ کے ڈھنگ کی ہے وہی خیالات اور وہی انداز بیان ہے۔ بعض بعض جگہ قدیم الفاظ جیسے ٹک بمعنی ذرا، نلک، انت، بے چیز بمعنی بے سبب وغیرہ بھی ہیں۔

ذیل میں ایک غزل درج کی جاتی ہے۔

نہ ساقی ہے نہ مینا ہے نہ بزم میں یار جانی ہے
حقیقت میں ہیں جیتے بصورت زندگانی ہے

ہوا کو ٹھے پہ جونہی جلوہ گر وہ برق دل و دینی
کہا اک خلق نے دیکھو یہ آفت ناگہانی ہے

نوازش پر مزاج آیا جہاں نہ دی گالیاں مجھکو
کرم ہے آپ کا طرفہ عجائب مہربانی ہے

مرا زخم جگر جراح سے سلوائیں کیوں ہمدم
کسی شمشیر زن کے ہاتھ کی یہ تو نشانی ہے

سنو ٹک گوش دل سے قصۂ جانسوز کو میرے
کہ جگ بیتی نہیں ہے آپ بیتی یہ کہانی ہے

عبث ہی سوچ تجھ کو نامہ بروشوق ہی مجھکو | کوئی کچھ کی کوئی گالی اگر اس کی زبانی ہی
تو اپنے ہاتھ کا چھالا جو ہر اک سے چھپاتا ہی | پتا افسوس کس پردہ نشین کی یہ نشانی ہی

نالوں میں کبھی نہ دیکھی تاثیر | آہوں میں کبھی اثر نہ دیکھا

عرصۂ عمر بہت کم ہی دلا گل کی طرح | چمن دہر میں دن کاٹ تو ہنس کر اپنا

جی ہو کے بہ تنگ سخت گھبرایا ہے | کیا مرا ناک میں دم آیا ہے

روتا ہوں تری گلی میں دل کھو کر | کیا ہنستا ہے کچھ تو نے پڑا پایا ہے

مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں یہ اشعار انتخاب کیے ہیں۔

قفس سے چھوٹنے کی امید ہی نہیں افسوس | حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد | بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں

دیکھتے ہی اسے حاضر ہوئے مرجانے کو | وہی اشخاص جو یاں آئے تھے سمجھانے کو

کیوں نہ ہو اس قدر گھمنڈ اس بت پر غرور کو | صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو

اسکے اٹھنے ہی جی پہ آن بنی | دیکھیے آگے آگے کیا ہووے

صورت تجھے حق نے دی پری سی | پر آدمیت نہ دی ذری سی

کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف | مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

باغ اردو یہ افسوس کا شاہکار اور نہایت مقبول و معروف کارنامہ ہے اور سچ پوچھو تو آج ان کا نام اسی سے زندہ ہے۔ یہ حضرت شیخ سعدی رحمۃ ۱۱۸۴ء سنہ ۱۲۹۱ ۱۶ کی مقبول عالم کتاب گلستاں کا

اُردو ترجمہ ہے اس کے ترجمہ کرنے کی تقریب خود افسوس نے اس طرح بیان کی ہے "ایک دن صاحب موصوف (ڈاکٹر گل کرسٹ) نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اُردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بہ ظاہر صاف وہ بہ باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی ؎ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ ارادہ کیا اس سے پہلو تہی اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیہ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اُسے ترجمہ کروں اگر بخوبی سرانجام ہوئی اور اہل معنی کو پسند پڑی فبہا و الّا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علما و عقلا و شعرا کہ یہاں تھے ان کو پسند پڑا۔ تب اس ضعیف نے کمر ہمت بقوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔"

"باغ اُردو" کی تاریخ تالیف میں اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے لکھا ہے کہ ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی۔ نیز مولف سرالمصنفین نے یہی سنہ لکھا ہے۔

مگر خود افسوس نے اس کے دیباچہ میں ایک قطعہ تاریخ دیا ہے جس سے آغازِ تالیف کا سنہ نکلتا ہے۔

میں تاریخ اس کی جو چاہا مو نام — کہوں دلچسپ بہ آئینِ نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا — کہ آغازِ اردو ہے باغ اردو

"باغ اردو" کے اعداد (۱۲۱۴) میں آغاز اردو یعنی الف کے عدد کا تدخلہ کیا جائے تو اس سے ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی اس کی تالیف کی تاریخ ہے۔ باغ اردو کی اشاعت خود افسوس کے اہتمام ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء میں ہوئی تھی۔ پھر خود افسوس نے خاتمہ الکتاب میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ "سن ہجری بارہ سے سولہ اور عیسوی اٹھارہ سے دو میں ترجمہ کہ مسمیٰ بہ باغ اردو ہے تمام ہوا" اس کے بعد یہ قطعۂ تاریخ دیا ہے۔

عونِ توفیق رب سبحان سے — ترجمہ یہ کیا تمام میں نے جب
ختم کی اس کے پیر عقل سی کی — میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا[1] — باغ اردو ہوئی گلستاں اب

نیز اس وقت ہمارے پیش نظر جو نسخہ کلکتہ کا مطبوعہ ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء میں طبع کرایا تھا۔ ان شواہد کی موجودگی میں اس کی تاریخ تالیف ۱۸۰۸ء کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔

افسوس کی یہ گراں قدر کتاب آج کل بالکل کم یاب ہے

---

[1] ا ب ا کے ۳ دو شامل کرنے کے بعد بھی چھپے مصرع نی ۱۸۰۲ء برآمد ہوتے ہیں ۱۲

سر المصنفین کے مولف کو باوجود تلاش وسعی بلیغ کے ایک نسخہ بھی حاصل نہ ہو سکا ان کا بیان ہے کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں انھوں نے ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا ہمارے پیش نظر اس وقت جو نسخہ ہے وہ کلکتہ میں ۱۲۵۱ھ میں طبع ہوا اور کلکتہ کی قدیم مطبوعات کی طرح ٹائپ کے حروف پر ہے یہ نسخہ بالکل مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔ کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ میں بھی ایک نسخہ اسی سنہ اور طبع کا مطبوعہ محفوظ ہے مگر اس میں دیباچہ کے چار صفحوں کا حاشیہ کسی قدر کرم خوردہ ہے۔

باغِ اردو کی ترتیب مضامین حسب ذیل ہے:۔

۱۔ احوال رسم خط۔ اس عنوان سے افسوس نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے رسالہ رسم الخط و اعراب کا خلاصہ لکھا ہے۔

۲۔ پہلا دیباچہ "تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذروں میں کتاب کے" اس میں افسوس نے اپنے مربی لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کی مدح کی ہے اور سرسری طور پر اپنے حالات لکھ کر ترجمہ کی مشکلات کا ذکر اور صاحبان فہم کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا عذر کیا ہے۔

۳۔ ترجمہ دیباچہ شیخ سعدی رح۔

۴۔ ترجمہ متن گلستاں مشتمل بر ہشت ابواب۔

۵۔ ترجمہ خاتمہ اصل کتاب۔

۶۔ خاتمہ باغ اردو کا۔

۷۔ "چند سطور بعضے عذروں میں اور فائدہ میں" اس حصہ میں اپنے ترجمہ کے طریقہ پر بحث کی ہے۔

۸۔ "چند سطریں شیخ مرحوم کے احوال میں، اس میں شیخ سعدیؒ کے حالات اور ان کے بعد امیر خسروؒ کا ذکر خیر اور شعرار کی قدر دانی کا بیان اور الناس علی دین ملاکہم کی تشریح کی ہے۔

۹۔ فائدہ۔ اس میں اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مولف و مصنف کے لیے بھاکا، فارسی عربی، اور قدرے سنسکرت اور ترکی جاننا ضروری ہے۔ نیز بلاغت اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔

اردو زبان میں گلستاں کے ایک دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہم ٹھیک طور پر موازنہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ افسوس کا ترجمہ بہترین ہے یا نہیں لیکن صرف ان کے ترجمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ افسوس نے گلستاں کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے ماہنوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ زبان سلیس و صاف ہو اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور ان کا ترجمہ ان کے اپنے زمانہ کی اردو کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔

گلستاں میں جا بجا برمحل اشعار بکثرت ہیں ان اشعار کا اگر نثر میں ترجمہ کیا جائے تو ان کی اصلی خوبی بالکل غائب ہو جاتی ہے اور شیخ سعدیؒ کے بعض مصرعے اور شعر ایسے فصیح و بلیغ ہیں اور کہاوت بن کر زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں کہ وہ کسی طرح ترجمہ کے متحمل ہی نہیں۔ افسوسؔ نے ایسے مصرعوں کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر ان کے حسن و خوبی کو خراب نہیں کیا بلکہ انہیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے۔ افسوسؔ کے طرزِ بیان میں میرامنؔ کے بیان کا سا لوچ اور بے ساختہ پن نہیں۔ میرامن کی زبان بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے وہ جو بات کہتے ہیں روزمرّہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی اس کے برخلاف افسوسؔ کی زبان میں سلاست و صفائی کے ساتھ سنجیدگی و وقار پایا جاتا ہے وہ عربی فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور اس خصوص میں سیّد حیدر بخش حیدریؔ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مثال کے طور پر ان کے ترجمے کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:-

گلستاں

حکایت :- یکے از دوستاں را گفتم کہ امتناع سخن گفتنم بہ علت آں اختیار آمدہ است کہ غالب اوقات در سخن نیک و بد اتفاق افتد و دیدۂ دشمناں جز بر بدی نمی آید گفت دشمن آں بہ کہ نیکی نہ بیند

شعر :- ہر بہ چشم عداوت بزرگتر عیبے است
گل است سعدی و در نظر دشمناں خار است

بیت :- نور گیتی فروز چشمۂ ہور
زشت باشد بچشم موشک کور

حکایت :- یکے از بزرگاں پارسائے را گفت کہ چہ گوئی در حق فلاں عابد کہ دیگراں در حق او بہ طعنہ سخنہا گفتہ اند گفت بظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش غیب نمی دانم

:- ہر کسے را کہ پارسا بینی
پس بر دے طعنہ چگونہ کنم
پارسا داں و نیک مرد انگار

باغ اردو

حکایت۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب سے اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے اور آنکھ دشمن کی سوائے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی بولا وہ کہ بے یا در دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔

شعر :- ہر بڑا عجیب ہنر دشمن کی آنکھوں میں
پھول ہو سعدی تو ہے آنکھ میں دشمن کی خار

بیت :- گو جہاں روشن ہے سورج سے سدا
پر چھچھوندر کی نظر میں ہے برا

حکایت۔ ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے

جسکو ظاہر میں متقی دیکھے
اس کے تقوی کا تو نہ کر انکار

ورنہ دانی کہ در بنانش چیست، ما را درون خانہ چہ کار
حکایت۔ درویشے را شنیدم کہ در آتش فاقہ
می سوخت و خرقہ بر خرقہ می دوخت و تسکین
خاطر خود را می گفت ؎

بنان خشک قناعت کنیم و جامۂ دلق
رنج محنت خود بہ کہ بار منت خلق

کسے گفتش چہ نشینی کہ فلاں دریں شہر طبع
کریم دارد و کرم عمیم۔ میاں بہ خدمت آزادگاں
بستہ و بر در دلہا نشستہ۔ اگر بر صورت حالت
چناں کہ ہست وقوف یابد۔ پاس خاطر عزیزاں
داشتن منت دارد و غنیمت شمارد۔ گفت
خاموش کہ در پستی مردن بہ کہ حاجت پیش
کسے بردن۔ قطعہ

ہم رقعہ دوختن بہ و الزام کنج صبر
گز بہر جامہ رقعہ بر خواجگان نوشت
حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

کھوج مت کر کسی باطن کی محتسب ترا درون
خانہ چہ کار۔ حکایت۔ ایک فقیر کو میں نے
سنا ہے کہ فاقہ کی آگ میں جلتا پیوند گانٹھتا
اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ہے

لباس فقر و نان خشک پر میں یہ لازم ہے کہ ہم بیٹھوں قناعت
ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا، بہتر ہے کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو۔ فلانا شخص
اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم
اپنا اس نے کھول دیا ہے اور اپنی کمر کو
آزادوں کی خدمت کے لیے باندھ لیا ہے
اگر صورت حال پر تیری اطلاع پا وے تو اپنے
پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت
جانے کہا اس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا
اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا چنانچہ
کہہ گئے ہیں ؎

پیوند گانٹھ۔ صبر کا کونا کر اختیار
پر اغنیا سے کہ نہیں جامہ کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب
جانا ترا جو گلشن فردوس میں ہوا

گلستاں سعدیؒ کے ترجمہ سے فارغ ہو کر ۱۸۰۲ء میں افسوس نے بجائے کسی اور تالیف یا ترجمہ کے دوسری کتابوں کی تصحیح و نظرِ ثانی کا کام انجام دیا۔ اور آواخر ۱۸۰۴ء تک اسی میں مشغول رہے۔ سب سے پہلے میر بہادر علی حسینی کی کتاب "نثرِ بے نظیر" کی نظرِ ثانی کی۔ پھر نہال چند لاہوری کی کتاب "مذہب عشق" کی تصحیح کی۔ یہ دونوں بھی فورٹ ولیم کالج کے منشی اور مشہور اہل قلم ہیں۔ ان کا تفصیلی حال آگے علیحدہ عنوانات سے لکھا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے لیے علاوہ نثر کی کتابوں کے نظم کی کتابیں بھی مطلوب تھیں ان کا اردو میں کافی ذخیرہ موجود تھا صرف نظرِ ثانی اور سلیقے کے ساتھ انتخاب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مرزا رفیع سودا کا دیوان داخلی و خارجی دونوں قسم کی اعلیٰ شاعری کا عمدہ مجموعہ ہونے کی وجہ سے نظرِ اوّل میں چن لیا گیا۔ اور اس کی تصحیح و انتخاب کا کام افسوس اور چند دیگر اہل قلم کے سپرد کیا گیا افسوس اور ان کے ساتھیوں وغیرہ نے اپنے حسن مذاق سے کلیات سودا کا ایک ایسا انتخاب مرتب کیا جس میں ہر صنف سخن کا بہترین نمونہ موجود ہے اس کے نسخے بھی کمیاب ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ میں ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ ہمارے پاس بھی ایک نسخہ ہے یہ ۱۸۱۰ء کا مطبوعہ ہے اور اس میں سودا کے چند چوٹی کے قصاید و غزلیات کا بہترین انتخاب اور

مثنوی ہر ثیہ اور قطعات کے عمدہ نمونے صحت کے ساتھ مندرج ہیں۔

آرائش محفل منشی افسوس کا ایک اور یادگار کارنامہ "آرائش محفل" ہے یہ ہندوستان کی ایک معتبر و مستند فارسی تاریخ موسوم بہ "خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے "خلاصۃ التواریخ" کے مصنف منشی سجان رائے پٹیالہ کے باشندے تھے اور انہوں نے ۱۱۰۷ء میں یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے تیار کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی جمیع عمدہ تواریخ کا خلاصہ ہے انہوں نے اپنے جو ماخذ بتائے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

عہد ہنود (۱) مہابھارت، راماین اور ہربونسہ کے فارسی ترجمے جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے تھے (۲) بھگوت گیتا، یوگا اور سیشتا جو شیخ احمد اور دیگر علما نے داراشکوہ کے لیے فارسی میں ترجمے کیے تھے (۳) گل افشاں یعنی سنگاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ (۴) پدماوت یعنی رتن سین مہارانا چتوڑ کی تاریخ وغیرہ۔

عہد اسلام (۱) بتاریخ محمود غزنوی از مولانا عنصری (۲) تاریخ سلطان شہاب الدین غوری (۳) تاریخ علاء الدین خلجی (۴) تاریخ فیروز شاہی از مولانا عزیز الدین خالد خانی (۵) تاریخ افاغنہ از حسین خاں افغانی (۶) ظفر نامہ از شرف الدین یزدی (۷) تیمور نامۂ ہاتفی (۸) تواریخ بابری (۹) اکبر نامہ ابوالفضل (۱۰) طبقات ناصری (۱۱) جہانگیر نامہ (۱۲) تاریخ شاہ جہاں از وزارت

خاں (۱۳) تاریخ عالمگیر از میر محمد کاظم وغیرہ۔

چونکہ مصنف کے پیشِ نظر ہر بادشاہ اور راجہ کے متعلق اس کے معاصرین کی تاریخ تھی اس لیے اس نے ان سے استفادہ کرکے نہایت معتبر و صحیح تاریخ مرتب کی ہے۔ افسوس نے مسٹر جے ۔ ہیرنگٹن کے ایما سے ۱۲۱۹ھ میں اس کا اردو میں ترجمہ کر ناشروع کیا اور عہدِ ہنود کا پورا حصہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ختم کرکے "آرائشِ محفل" اس کا نام رکھا۔ "آرائشِ محفل" پہلی مرتبہ ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اور چند سال بعد ہی اردو دانی کے اعلیٰ امتحانات میں داخلِ نصاب ہوگئی۔ اس ضرورت کے سلسلہ میں ۱۸۴۴ء اور ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے اس کے دوسرے ایڈیشن نکلے۔ اس کے بعد لکھنؤ اور لاہور کے مطابع سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

جان شکسپیر نے اس کے دس ابواب کا انگریزی ترجمہ بھی اپنی "منتخبات ہندی" مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء میں شائع کیا ہے اس کے علاوہ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کو انگریزی میں منتقل کرکے ۱۸۷۱ء میں الہ آباد اور ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے دو ایڈیشن شائع کیے۔ آرائشِ محفل میں ہندوستان اور اس کے مختلف صوبجات کا مفصل بیان وہاں کی پیداوار وغیرہ کے حالات کے ساتھ دیا ہے اس کے بعد زمانۂ قدیم سے لے کر فتوحات

اسلامیہ تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی ہے اس کتاب کا طرز بیان مضمون کتاب کی نوعیت کا لحاظ کرتے بالکل سلیس اور صاف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی پائی جاتی ہے گو اس میں اس زمانہ کی عام کتابوں کی طرح مبالغہ آرائیاں نہیں ہیں تاہم بعض موقعوں پر ان کا قلم بے راہ ہو جاتا ہے اور تعریف میں دو چار فقرے زیادہ نکل جاتے ہیں ذیل میں پہلے باب کا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے طرز بیان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مملکت ہندوستان کی تاریخ

"جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا سینکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں کوئی ادنیٰ کوئی اعلےٰ لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم جا بجا ایک نئی طرح کا عالم، ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر موسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں اکثر بیسیوں مسجدیں خانقاہیں مدرسے۔ باغات۔ غریبوں بے کسوں مسافروں کے لیے متعدد مکانات۔ قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سینکڑوں گاؤں ان میں بسیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل

ان کے نیچے برسیں ۔ ندی نالے تالاب کویں لطیف و پاکیزہ ہزارہا پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا ۔ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں تواڑے بجرے وغیرہ بے شمار ۔ شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوئے تیار ۔ اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار ۔ ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار ۔ ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا ۔ سودے والوں کی دکانیں جا بجا مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں ۔ بیت

جہاں دیکھیے خیر ہی خیر ہے　　　سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سوا اس کے راہ میں اگر سونا اچھالتے چلے جائیں کہیں خطرہ نہیں اور جنگل میں جہاں جاہیں سو رہیں کچھ پروا نہیں چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے مال و متاع غلہ دور دور سے بھر لاتے ہیں اور منزل مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں ۔"

آرائش محفل صفحہ (۳)

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم میں مشہور تو بہت ہیں لیکن عام طور پر ان کے حالات کا کوئی علم نہیں۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے اس کالج کے دیگر مولفین کی طرح ان کے ساتھ بھی بے حد بے اعتنائی کی ہے اسی وجہ سے ان کے حالات کا پتہ چلانا سخت مشکل ہے۔ اتفاق سے ہم کو ان کی تالیفات اور منشی کریم الدین کے تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" اور چند متفرق ذرائع سے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو گئیں۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم ہے اور یہ وہی صاحب ہیں جن کی حسن سعی و اہتمام سے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی (۱۱۶۷ھ ۔ ۱۲۳۰ھ) کا اردو ترجمہ قرآن مجید پہلی بار شائع ہوا تھا۔ ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ حسینی خاص دہلی کے باشندے ہیں یا کسی اور شہر کے مگر بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن شاہجہاں آباد دہلی تھا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلی میں تشریف رکھتے تھے اور آپ کے رشد و ہدایت سے خاص طور پر اہل دہلی مستفید ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ "ترجمہ القرآن" کا پہلا ایڈیشن بھی حسینی کے والد کے

اہتمام سے شائع ہوا تھا، دہلی ہی میں طبع ہوا۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ حسینی دہلی کے باشندے تھے اس کے علاوہ ایک اور شہادت یہ ہے کہ میر امن اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچہ میں فورٹ ولیم کالج میں اپنے ملازم ہونیکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی" میر امن کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ حسینی سے ان کی گہری اور بے تکلف دوستی تھی۔ میر امن تو خاص دہلی کے باشندے تھے جب وہ تلاش معاش میں دہلی سے نکلے تو پہلے چند سال عظیم آباد میں گزارے اور پھر کلکتہ کا رخ کیا ان کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حسینی سے یا تو دہلی ہی سے راہ و رسم رکھتے تھے یا ان کی ملاقات اور شناسائی عظیم آباد کی ہو گی مگر ہمارے نزدیک پہلا خیال مرجح ہے اور حسینی ضرور میر امن کے اہل وطن اور دہلی ہی کے بے تکلف دوست ہوں گے۔

میر امن کے محولہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حسینی ان سے پہلے ہی فورٹ ولیم کالج کی سلک ملازمت میں منسلک ہو چکے تھے مگر ان کی تالیفات کا سلسلہ ۱۸۰۲ء م ۱۲۱۷ھ سے شروع ہوتا ہے اور ان کی آخری کتاب ۱۸۰۵ء میں ختم ہوئی۔ معلوم نہیں کہ وہ کب تک اس کالج کے متوسل رہے ان کے حالات

کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اطلاع حاصل نہ ہو سکی۔ منشی کریم الدین نے ان کو شاعر اور "ذی قدر شاعر" بنایا ہے وہ حسینی تخلص کرتے تھے مگر ان کا ایک آدھ شعر بھی نہ مل سکا۔ اور نہ خود کریم الدین نے نمونہ کلام دیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ پیشہ ور شاعر نہ ہوں بلکہ اس زمانہ کے عام شرفا اور تعلیم یافتہ اشخاص کی طرح تفنن طبع کے طور پر شعر گوئی کا مشغلہ رکھتے ہوں نہ اخلاق ہندی میں بعض بعض جگہ چند ابیات پائی جاتی ہیں غالباً انہی کی ہوں گی مگر وہ ان کی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ نہیں اور نہ وہ شاعر کی حیثیت سے قابل قدر ہیں ان کے اصلی کارنامے ان کے دیگر ساتھیوں کی طرح نثری کتابیں ہیں اور وہ حسب ذیل چار ہیں (۱) نثر بے نظیر (۲) اخلاق ہندی (۳) ستار نخ اسام (۴) رسالہ ڈاکٹر گلکرسٹ ان کے علاوہ انہوں نے حکایات لقمان وغیرہ کے ترجمہ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی امداد کی اور قرآن مجید کے ترجمہ میں بھی حصہ لیا ہے۔ پہلی دو کتابیں یعنی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ایک ہی سال کی لکھی ہوئی ہیں اور ان کے ایک بیان سے جس کو ہم آگے نقل کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ نثر بے نظیر سب سے پہلے لکھی گئی ہے۔

نثر بے نظیر یہ اردو کی شہرۂ آفاق مثنوی سحر البیان کا جس میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے

عشق و محبت کی دل آویز داستان بیان کی گئی ہے نثری خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے نو آموزان اُردو کو مثنوی میر حسن کے مطالب سے لطف اندوز کرنے اور اس نظم کے مطالعہ میں سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے اس کو نثر میں لکھوایا تھا۔ اس کی کیفیت خود ان کی زبان سے سنئے، قصۂ بے نظیر و بدر منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، ادا بند یکتا، رونق بزم سخن، میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین صاحب دہلوی کا تھا۔ فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخندان منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں وہی اس کی طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے بلکہ کوئی ان رمزوں کو پا تو سکے۔

قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں ہر کہ دمہ مشغول ہو اس کی تعریف میں

اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۷ ہجری مطابق ۱۸۰۲ عیسوی کے حکم سے صاحب خداوند نعمت جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصہ سے موافق محاورۂ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق

بہ طرز سہل واسطے صاحبان نوآموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے، اس رویہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زباں داں و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے اور اس ہیچدان کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر اشارہ کیا ہے حسینی نے اس کو اپنی یادگار بتایا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے اپنی دوسری کتابیں نہیں لکھی تھیں نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کو ۱۸۰۲ء سے قبل ہی غالباً مسودہ کی صورت میں مرتب کر کے اہل ذوق کو سنایا تھا اور ان کی پسندیدگی حاصل کی تھی بظاہر یہ ان کا کوئی شاندار کارنامہ نہیں معلوم ہوتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک پر لطف چیز ہے میر حسن کی اصل مثنوی میں جو لطف ہے وہ یقیناً کسی طرح اس نثری خلاصہ میں نہیں آسکتا مگر حسینی نے دو دو چار چار فقروں کے بعد اصل مثنوی کے ایک ایک دو دو شعر بھی لکھ دیے ہیں جو نثر کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اس طرح یہ نثری خلاصہ بھی دلچسپی اور لطف سے خالی نہیں چونکہ یہ کتاب کمپنی کے یوروپین ملازمین کی خاص تعلیمی ضروریات کے مد نظر لکھوائی گئی تھی اور اس کو اردو دانی کے اعلیٰ نصاب میں اصل مثنوی کے ساتھ شریک کیا گیا تھا۔

اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ کے اہتمام سے اصل مثنوی کے ساتھ ہی سنہ ۱۸۰۳ء میں شایع ہوئی۔ گل کرسٹ نے اپنی "بیاض ہندی" میں اس کا بھی ایک نمونہ چھاپا ہے دوسرے ایڈیشن کے وقت پر میر شیر علی افسوس نے گل کرسٹ کے ایماء سے اس کی نظر ثانی بھی کی اور۔ اس کے بعد متعدد ایڈیشن ہندوستانی مطابع سے شائع ہوئے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی اور انگریزی میں ایم۔ ایچ کورٹ نے اس کا ترجمہ بھی کر کے سنہ ۱۸۷۱ء میں شملہ سے شایع کیا۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ بڑی سعی و تلاش کے بعد ہم کو ایک نسخہ حاصل ہوا یہ کالج پریس کلکتہ کا مطبوعہ سنہ ۱۸۷۰ء سے چھوٹی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔ ذیل میں چند سطریں "داستان سواری کی تیاری" سے بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں :-

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے بارھواں برس آیا الحمد اللہ! جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف مچ گئی۔ مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارھویں میاں کی کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ

صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کہ میں شہزادے کو لے کر سوار ہوں گا۔ تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو اور بستی ان کے دل کی بھی آباد ہو تمام نقیبوں کو تقید کر و گھر گھر یہ حکم پہنچاویں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے احیاناً کسی کو اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ مابدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ (نظم)

کمر یں شہر کو مل کے آئینہ بند ۔۔۔ سواری کا ہو نور جس سے دو چند

لنتے میں شام پڑی۔ آفتاب والشمس پڑھ کے سجدہ شکر میں گیا۔ مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا۔ حضرت محل میں تشریف لے گئے تمام رات ناچ راگ رہا۔ مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم

عجب شب تھی وہ جوں سحر سفید ۔۔۔ عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات آخر ہوئی۔ چاند نے بالیں استراحت پر اپنا سر رکھا اور سورج بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ (نظم)

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو | کہ بابا ہنادھو کے تیار ہو
پلا آتشیں آب پیر مغاں | کہ بھولے مجھے گرم و سرد جہاں
اگر چاہتا ہے مرے دل کو چین | نہ دنیا وہ ساغر جو ہو قاتین،

(نثر بے نظیر مطبوعہ ۱۸۰۳ء ص ۲۷)

اخلاق ہندی یہ بہادر علی حسینی کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ ہے اور حقیقت میں ان کا نام بھی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہی سے زندہ ہے" اخلاق ہندی" دراصل زمانہ قدیم میں ہتوپدیش کے نام سے سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ فارسی میں اس کے دو تین ترجمے ہوئے ایک ترجمہ جو عام طور پر بہت مشہور ہے۔" نگار دانش" کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے کا نام" مفرح القلوب" ہے یہ مفتی تاج الدین کا ترجمہ ہے۔ آخر الذکر ترجمہ بھی ایک زمانہ میں کافی شہرت رکھتا تھا مگر آج کل اسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ حسینی نے اخلاق ہندی کے دیباچہ میں اس کی تالیف کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے یہ" کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی پہنچی جب انہوں نے سنا اس میں قصے از بسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت میں نہایت مرغوب اور باتیں خوب اور حکایتیں اکثر مفید تب اپنے ملازموں میں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ

سلیس فارسی میں کر دوں تاکہ میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب ان میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجالایا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا"۔

نگار دانش اور مفرح القلوب کے تقریباً تمام قصے ایک ہی ہونے کے باوجود اشخاص قصہ کے اسماء جداگانہ ہیں اور ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ نگار دانش میں بید پائے برہمن رائے وابشلیم سے قصے بیان کرتا ہے اور مفرح القلوب میں ان قصوں کا راوی پنڈت بشن شرما ہے اور ساری داستان کی تقریب یہ بیان کی گئی ہے کہ گنگا کنارے مانک پور نام ایک شہر آباد تھا اور وہاں کا راجہ چندرسین نہایت سخی عادل اور اولوالعزم تھا مگر اس کے بیٹے نہایت بدتمیز اور نالائق تھے راجہ ان کی بیہودہ حرکتیں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا مگر کوئی تدبیر ان کو راہ پر لانے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آخر ایک روز سر دربار ان کی بے ادبانہ حرکات دیکھ کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا ایک درباری پنڈت بشن شرما نے ان کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور ان کو اپنے ہمراہ گھر لایا یہاں ان سے وہ تمام سبق آموز اور عبرت انگیز قصے بیان کیے جو اس کتاب میں مندرج ہیں ان قصوں کو سن کر راجہ کے لڑکے نیکی اور علم کی طرف مائل ہوئے اور راجہ نے خوش ہو کر اس پنڈت کو بہت سا دان دچھنا اور خلعت انعام دیا۔ غرض یہ صاف ظاہر ہے

کہ فارسی کے دونوں مترجموں کے پیشِ نظر علیحدہ علیحدہ سنسکرت کے نسخے ہیں۔

بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۲ء م ۱۲۱۷ھ میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے فرمانے سے مفرح القلوب کو "سلیس روزمرہ ریختہ" میں ترجمہ کر کے "اخلاقِ ہندی" کے نام سے موسوم کیا۔ "اخلاقِ ہندی" چار ابواب پر مشتمل ہے "پہلے باب میں ذکر دوستی کا۔ دوسرے میں دوستوں کی جدائی کا تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا جو اپنی فتح اور مخالف کی شکست۔ چوتھے میں کیفیت ملاپ کی خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے۔"

"اخلاقِ ہندی" کا ایک طویل اقتباس سب سے پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ کی "بیاضِ ہندی" میں چھاپا گیا۔ پھر اسی سال یعنی ۱۸۰۳ء میں کلکتہ میں پوری کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور ایک عرصہ دراز تک مقبولِ خاص و عام رہی۔ سر جارج گریرسن کی کتاب "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش پچاس سال میں اس کے دس بارہ ایڈیشن بمبئی، مدراس، بنگلور، کلکتہ اور لندن وغیرہ میں چھپے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر نسخہ بھی بمبئی کے مطبع فتح الکریم میں ۱۳۰۵ھ میں چھپا ہے جو ہمیں اپنے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے دستیاب

ہوا ہے ۱۸۶۶ء میں ایک صاحب سید عبداللہ نامی نے اس کا ایک نفیس ایڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع کیا تھا۔ اس میں تمہید اور حاشیہ بھی تھا۔ خود مولف کے زمانہ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ اول تو ان دنوں ایسی قدیم اور اوراق پارینہ کی حیثیت رکھنے والی کتابوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایسی دائمی مقبولیت نہیں حاصل کر سکتی جیسی کہ باغ و بہار کو نصیب ہوئی۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مفرح القلوب ایک زمانہ میں خوب مشہور تھی۔ قدیم اُردو دکھنی میں بھی اس کا ایک ترجمہ ہوا ہے جس کو شیخ محمد یحییٰ بیدری نے ۱۱۷۶ھ میں کیا اس ترجمہ کا نام بھی مفرح القلوب ہے اس کا طرز بیان اور زبان بہت سلجھی ہوئی اور صاف ہے اس کا بھی ایک قلمی نسخہ ہمارے دوست مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

بہادر علی حسینی کا طرز بیان بالکل سیدھا سادہ ہے مگر اس میں کوئی خاص دلکشی نہیں وہ مسلسل فقرے لکھتے جاتے ہیں مگر پڑھنے والا ان کے اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زبان نہایت سلیس اور صاف ہے لیکن پھیکی ضرور ہے میر امن تو کیا شیر علی افسوس کے طرز بیان میں لوچ اور گھلاوٹ ہے وہ ان کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

قصہ کہانی کی زبان میں محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی کے بغیر لطف پیدا کرنا سخت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زبان میں فرسودگی اور کہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ قواعد کے بڑے پابند ہیں اور کبھی اضافتیں وغیرہ حذف کرنا پسند نہیں کرتے ان کے فقرے طولانی اور قواعد زبان کے لحاظ سے بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ مگر اس سے پڑھنے والے کا جی اکتا جاتا ہے اگر وہ مکالمہ کے موقعوں پر بول چال کے چھوٹے چھوٹے مگر پر لطف فقرے استعمال کرتے تو شاید اس سے قصہ کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا اخلاق ہندی نہ عربی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ ہندی الفاظ ہی کی بھرمار ہے بلکہ دونوں کو ایک خاص توازن سے نہایت احتیاط کے ساتھ برتنا ہے اسی وجہ سے وہ دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سلیس رواجی ریختہ" میں ترجمہ کیا ہے۔

ذیل میں ایک حکایت نقل کی جاتی ہے جس سے ان کے طرزِ بیان کی خصوصیتیں ظاہر ہو جائیں گی۔

"ایک پرانا سانپ کہ اس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی ایک جھیل کے کنارے پر آہستہ آہستہ آکر غمگین ہو بیٹھا۔ تب مینڈکوں کے بادشاہ نے اس سے پوچھا اے سانپ تجھے کیا ہوا ہے جو اتنا دلگیر ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے پرائی کیا پڑی ہے تو اپنی نبیڑ مینڈک

بولا۔ اے سانپ ناخوش کیوں ہوتا ہے اگر کچھ تیری چیز پانی میں گر پڑی ہو تو کہہ دے اپنے لشکر کو حکم کروں کہ بجنسہٖ اس چیز کو ڈھونڈ لادے اس نے کہا اے مینڈک اس شہر میں ایک برہمن کا لڑکا بہت خوبصورت تھا اس کو میں نے کاٹا۔ ماں باپ نے اس کے درد سے کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ اس کے بھائی نے اس کو سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا۔ یوں اسے نصیحت کی کہ بھائی صبر کیجیے سب کی یہی راہ ہے چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ شعر[۱]

مت پوچھ رفتگاں کو کدھر تھی کہاں تھیں — شاہان نامور اور ہندوستین جو فی جواں تھیں

تب برہمن یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اے دوستو میں اس گاؤں میں نہ رہونگا کس واسطے کہ یہی ایک لڑکا میرا تھا سو خدا کی راہ میں گیا۔ اب مجھے بستی سے کیا کام بن باسی رہونگا تب انہوں نے کہا اے بھائی کوئی ڈاڑھی منڈھانے اور جامہ پھاڑ کر جنگل میں جا رہنے سے سادھو نہیں ہوتا مگر جس کی کرنی اچھی ہو۔ سو اے مینڈک میں نے اس وقت خواب دیکھا کہ مرد بوڑھا نہایت بزرگ صورت مجھ سے یوں کہتا ہے کہ اے سانپ

---

[۱] شعر کی پوری نقل ہے۔

تو نے اس لڑکے کے بہنے کو ناحق کاٹا کل قیامت کو تیری پلیٹھ پر مینڈک سوار ہونگے اور اسی عذاب میں ہمیشہ خدا تجھے گرفتار رکھے گا۔ اگر اس عذاب سے اپنا چھٹکارا چاہے تو کنارے جھیل کے جہاں مینڈک بہت سے ہوں جاکر ان کے سردار کو اپنی گردن پر سوار کر کے لیے پھراکر۔ مینڈک یہ بات سنتے ہی نہایت خوش ہو کر اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا نے مجھے مفت یہ گھوڑا دیا شاید میرے طالعوں کی مدد سے ایسی سواری ملی۔ اسی وقت سانپ کے پیٹھ پر چڑھ بیٹھا اور کہا فلانی جگہ میرا دشمن ہے اگر تو تصدیع کر کے مجھے وہاں تک لے چلے تو میں اسے ماروں۔ سانپ نے یہ بات مانی سب مینڈکوں کو اپنی جلو میں آگے رکھ کے چلا۔ جب اس تالاب کو چھوڑ کر آگے بڑھے سانپ نے جانا کہ اب یہ بھاگ کر اس تالاب تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ کسی بہانہ زمین پر لپنے کو گرا دیا مینڈکوں کے سردار نے پوچھا تو کیوں گر پڑا اس نے کہا کہ تیری فوج کو دیکھ کر مجھے بھوک لگی ہے۔ وہ بولا کہ میرے لشکر سے دو چار مینڈکوں کو کھالے۔ سانپ نے کہا اے بادشاہ لشکر کم نہ ہووے سے تجھ کو برا لگے گا وہ بولا تیرے

کھانے سے میری فوج کم نہ ہوگی سانپ ہر روز دو تین
مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔
اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں
کیا کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے
سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے
تب اس نے کہا تمہارے لشکر نے میرے پیٹ میں
چھاؤنی کی ہے بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب
نہیں اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں
داخل ہوں تو بہتر ہے تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ
ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہسوار کو زمین پر پٹک
کر کوڑے دم کے مارے اور کھا گیا جیسا کہ کسو
شاعر نے کہا ہے۔ فرد

گردن بندگی نت خم ہو در فرماں پر گو سر اپنا خدا کیوں نہ کرے چوگاں پر"

(اخلاق ہندی مطبوعہ ۱۳۰۵ھ ص ۱۷۰)

تاریخ آسام

بہادر علی حسینی کا تیسرا کارنامہ تاریخ آسام ہے۔ یہ
شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تاریخ
آسام کا اردو ترجمہ ہے۔ منشی کریم الدین نے طبقات الشعرائے
ہند میں لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں تمام ہوا۔ یہ شہنشاہ
اورنگ زیب عالمگیر کے جرنیل میر جملہ کی اس مہم آسام کی تفصیلی

تاریخ ہے جو ۱۶۶۲ء میں فتح ہوئی تھی۔ واقعات مہم کے ضمن میں آسام کی قدیم تاریخ اور مختلف حکومتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے شہاب الدین طالش خود اس مہم میں شریک تھا اور اس نے جو واقعات و حالات لکھے ہیں وہ اس کے چشم دید ہیں اور اس لحاظ سے نہایت معتبر و مستند کیے جا سکتے ہیں۔ اصل فارسی تاریخ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ بہادر علی کا ترجمہ بالکل نایاب ہے ہمیں اس کا کوئی نسخہ نہ مل سکا البتہ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی مؤلف "دکن میں اردو" کا بیان ہے کہ پیرس کے قومی کتب خانہ (ببلیا تھک نیشنل) میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ انہوں نے اس سے یہ عبارت نمونتاً اپنے مضمون میں شایع کی ہے۔

"شہر رجب کی بیسویں تاریخ کلیابر سے کوچ ہوا۔ آگے وہاں سے دو منزل تک لشکر کا کنارہ پکڑ کر چلنا تھا پر ندی کے سبب چو پہاڑ کے جتر میں کو ہو کر ہی ہے مقدور نہ تھا۔ اس لیے لشکر اور نواڑی کے درمیان بڑا اپچ پڑ گیا۔ ابن حسین نواڑی کا داروغہ جو تھا سو نواب کے حکم سے کچھ بعضی کام سنوارنے کے لیے فتح نشان چندوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔"

گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ ایک شخص ٹی پی وے نے اس تاریخ کو فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۴۵ء میں شایع کیا تھا۔

رسالہ گل کرسٹ بہادر علی حسینی کی ایک اور قابل ذکر تالیف "قواعد زبان اُردو مشہور رسالہ گل کرسٹ" ہے یہ در اصل ڈاکٹر گل کرسٹ کی کتاب "ہندوستانی کی صرف ونحو" کا ملخص ہے ڈاکٹر گل کرسٹ کے اُردو زبان کے قواعد اور اس وقت کے موجودہ کتب صرف ونحو کا مطالعہ کر کے ایک بسیط کتاب "ہندوستانی کی صرف ونحو" کے نام سے ۱۷۹۶ء میں مرتب کی تھی یہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل تھی مگر اس کی ضخامت کی وجہ سے متعلمین کو اس کے ازبر کرنے میں مشکلات پیش آتی تھیں حسینی نے رفع مشکلات کے خیال سے اس کو نہایت مختصر طور پر ملخص کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ غالباً اس کے بہت کم ایڈیشن نکلے۔ آج یورپ کے بڑے بڑے کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں اور اب اس کے نسخوں کا دستیاب ہونا مشکل ہے ہمارے دوست مولوی عمر یافعی صاحب حیدرآبادی کے ہاں اس کے دو نسخے ہیں ایک قلمی محررہ ۱۲۵۴ھ اور دوسرا مطبوعہ ۱۸۷۳ء مطبوعہ نسخے کے آخری چار پانچ صفحات غائب ہیں۔

یہ رسالہ دو مقالوں پر مشتمل ہے مقالہ اول میں مفردات اور دوم میں مرکبات سے بحث کی گئی ہے۔ مفردات کے تحت

علم صرف کے تقریباً تمام مسائل آگئے ہیں اور مرکبات میں مرکب تام و ناقص کی جملہ اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثالوں کے لیے بعض جگہ اساتذہ کے اشعار دیے گئے ہیں۔ تذکیر و تانیث کے اہم حصہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اُردو زبان کی تحقیقات کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض متاخر قواعد نویسوں کے برخلاف اس کی بنیاد فارسی قواعد کے تتبع پر رکھی گئی ہے اور تقریباً ترتیب بھی فارسی قواعد کی ہے۔

اہلِ زبان نے نثر نویسی کی طرح قواعد کی کتابوں کی طرف سے بھی بالکل بے اعتنائی برتی اور کبھی اپنے طور پر اس کی جانب توجہ نہیں کی اُردو کی قواعد پر سب سے پہلے غالباً اہل یورپ نے ہی کتابیں لکھی ہیں اور ایک عرصہ تک انہی کی کتابیں اُردو سیکھنے والوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ اہل ہند میں اس مضمون پر سب سے پہلے سید انشاء اللہ خاں دہلوی نے قلم اٹھایا اور ۱۲۲۲ھ م ۱۸۰۷ء میں نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے عہد حکومت میں دریائے لطافت لکھی۔ " رسالہ گل کرسٹ " اگرچہ اصل میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی محنت اور تحقیقات کا ثمرہ ہے مگر بہادر علی حسینی نے اس کا خلاصہ کرکے اس مضمون کے مولف میں اپنے لیے بھی ایک جگہ نکال لی اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی اصل کتاب کے کم یاب ہوجانے

سے ان کے خلاصہ کو اس کی جگہ مل گئی اور وہ خود قابل قدر بن گیا۔
ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس خیال سے کہ اُردو لٹریچر کے مطالعہ میں اکثر قرآن شریف کی تلمیحات نظر سے گزرتی ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے قرآن شریف سے واقف ہونا ضروری ہے کالج کی جانب سے اس کے بھی اُردو ترجمہ کا اہتمام کیا اور اس کام کے لیے پہلے بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ کو مقرر کیا اور پھر کاظم علی جوان اور دیگر علما کو بھی اس کی تصحیح و نظر ثانی وغیرہ کا کام سپرد کیا۔ یہ کام ان کے زمانہ میں برابر جاری رہا مگر ۱۸۰۴ء کے اواخر میں ان کے وطن واپس چلے جانے پر ان کے جانشینوں نے اپنے تعصب و تنگ نظری سے اس کام کو یک قلم موقوف کرا دیا۔ اور جو کچھ حصہ ترجمہ ہو چکا تھا اس کو بھی کالج کی جانب سے طبع نہیں کرایا۔ حسنِ اتفاق سے مولوی امانت اللہ نے جن پاروں کا ترجمہ کیا تھا وہ کسی اور شخص کی سعی سے جس کو کالج سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا شایع ہو گیا مگر بہادر علی کا کارنامہ محفوظ نہ رہ سکا اور اس وقت یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انہوں نے کن پاروں کا ترجمہ کیا۔

مرزا علی لطف

مولوی عبد اللہ خاں سابق منتظم کتب خانہ آصفیہ نے لطف کا تذکرہ گلشن ہند شائع کر کے ان کو اردو ادبیات میں ہمیشہ کے لئے مشہور کر دیا۔ نثر میں لطف کا یہی ایک کارنامہ ہے۔ بہ حیثیت شاعر گو وہ بلند پایہ نہ تھے مگر مشہور ضرور تھے۔ گلشن بے خار اور سخن شعرا میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالجبار خاں صاحب صوفی حیدر آبادی نے بھی اپنے مبسوط اور معرکۃ الآرا تذکرہ موسوم بہ محبوب الزمن میں ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور خود انھوں نے اپنے تذکرہ میں اپنی نسبتاً چند سرسری باتیں بیان کی ہیں اور یہ کہہ کر کہ "اب آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے طول کلام کا اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا۔" اپنے حالات ختم کر دیے اور کسی قدر انکسار اور ہیچمدانی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ اپنے حالات کے بالتفصیل نہ بیان کرنے کی وجہ تو خود نمائی سے احتراز اور منکسر المزاجی ہے اور دوسری یہ کہ اس زمانہ کے اکثر لوگ ان سے اور ان کے خاندانی حالات سے واقف تھے ان کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت

نہ سمجھی۔

ان کا نام مرزا علی اور لطفؔ تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا کاظم بیگ خاں تھا اور ہجریؔ تخلص کرتے تھے لطف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی غزل گوئی میں ان کو ید طولی حاصل تھا۔ ہجری نے اُردو میں کوئی شعر نہیں لکھا۔ لطف کے آبا و اجداد استرآباد کے باشندے تھے۔ ان کے والد ۱۱۵۲ھ میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور شاہ جہاں آباد میں سکونت اختیار کی اور پھر اسی کو وطن بنالیا۔ نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے جو ان سے استرآباد کی سکونت کے زمانہ میں دوستی رکھتے تھے، بادشاہ وقت کے دربار میں رسائی پائی اور اپنے کمالات ذاتی کی بناء پر مورد عنایات بادشاہی ہوئے۔

مرزا علی لطفؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ ان کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت بھی دہلی ہی میں ہوئی۔ ابتداء سے تحصیل علوم کا شوق تھا ارباب علم و فضل کے فیض صحبت سے عنفوان شباب میں علوم متداولہ حاصل کر لیے پھر شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ اُردو، فارسی میں شعر لکھنے لگے۔ فارسی کلام کی اصلاح تو اپنے والد سے لی مگر اُردو اصلاح کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف رائے ہے وہ

خود لکھتے ہیں کہ "مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔" مگر مصطفےٰ خاں شیفتہ نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ انہوں نے لطفؔ کا تذکرہ دیکھا ہے ان کو میر تقی میر کا شاگرد لکھا ہے مولف محبوب الزمن نے بھی غالباً ان ہی کے بیان پر میرؔ کا شاگرد بتایا ہے مگر نساخؔ مؤلف سخن شعرا نے صاف لکھ دیا ہے صاحب گلشن بے خار نے جوان کو شاگرد میر تقی کا لکھا ہے غلطی کی ہے اور علی الرغم ان کو مرزا رفیع سودا کا شاگرد بتایا ہے۔ مؤلف مجموعہ نغز کا بھی یہی کہنا ہے۔ مصحفی نے ان کی شاگردی کی نسبت کوئی صاف بات نہیں بیان کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لطفؔ کو میر تقی اور سودا سے کمال عقیدت ہے اور ہونی بھی چاہیئے مگر اس کے باوجود اپنے آپ کو ان دونوں میں سے کسی کا بھی شاگرد نہیں بتاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میر تقی یا مرزا سودا کے آگے ابتدائے مشق سخن کے زمانہ میں زانوئے شاگردی تہ کیا ہو۔ بہر حال ان کے تلمذ کا مسئلہ متنازع فیہ ہے۔

لطفؔ دہلی کی تباہی کے بعد بھی ایک عرصہ تک دہلی ہی میں رہے بالآخر ان کو آوارہ وطن ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ اور حیدرآباد ہی دو ایسے علم و فن اور دولت و حکومت کے مرکز تھے کہ جو کوئی دہلی سے نکلتا انہی دو مقاموں میں سے کسی ایک کا رخ کرتا۔ لکھنؤ دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی

کے اکثر شاعر اور ادیب وہیں آ کر بس گئے مگر جس زمانہ میں انھوں نے تلاش معاش میں دہلی کو خیرباد کہا اور سفر کا ارادہ کیا لکھنؤ میں کچھ زیادہ قدر افزائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اسی لیے انھوں نے حیدرآباد جانے کا تہیہ کیا۔ وہ گلشن ہند میں مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم بہادر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ نے ان کو اپنے ہاں حاضر ہو کر کلام سنانے اور اپنے مشاعرے میں غزل پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ عذر و معذرت کرنے لگے مگر ان کا عذر پذیرا نہ ہوا اور شہزادہ کے پے در پے تقاضوں پر بالآخر نواب آصف الدولہ کے ایما سے حاضر ہونا پڑا۔ شہزادہ نے قدر افزائی کی اور اشعار سن کر داد دی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لطفؔ نے لکھنؤ کی بھی صحبتیں دیکھی ہیں مگر غالباً وہاں ان کی ایسی قدر دانی نہیں ہوئی جیسی وہ چاہتے تھے۔ اور ہوتی بھی تو کیسے۔ آصف الدولہ کا آخری زمانہ اور لکھنؤ میں شعرا کی کثرت تھی۔ یہ بیچارے کس گنتی اور شمار میں تھے پھر بھی جو کچھ ہوا غنیمت تھا۔

الغرض لطفؔ نے حیدرآباد کے سفر کا ارادہ کیا اور چند روز عظیم آباد پٹنہ میں گزار کر بنگال کی سیاحت کرتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند مرتب کیا۔ تذکرہ

کے دیباچہ میں بھی اپنے حیدر آباد جانے کے ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے گلشن ہند کے مقدمہ میں لطفؔ کے بعض قصائد کی بناء پر جن کو ہم آگے نقل کریں گے۔ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لطفؔ اس فرمائش کے بعد نہیں تو اوّل ضرور حیدرآباد میں تھے مگر یہ خیال اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ دراصل لطف تذکرہ کی تدوین کے بعد دکن آئے

اس وقت حیدرآباد صانہا اللہ عن الشرور والفتن کے تخت حکومت پر نواب میر نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی جلوہ فرما تھے اور اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر مدارالمہام تھے اگرچہ یہ زمانہ حیدرآباد کے لیے کچھ زیادہ امن وسکون کا نہ تھا اور نواب آصف جاہ بہادر کو باغیوں کی سرکوبی اور انگریزوں کی امداد میں پے درپے مہمیں روانہ کرنی پڑتی تھیں اور وہ خود بھی بہ نفس نفیس ان جنگوں میں شریک رہتے تھے تاہم دکن میں اس زمانہ میں شعروشاعری کا چرچا گھر گھر تھا بادشاہ اور امراء دونوں شعراء کی قدردانی میں داد فیاضی دے رہے تھے۔ اور شمالی ہند کے اکثر شعراء دکن میں آکر دولت سے مالا مال ہو نے جاتے تھے یہاں کی بزم شاعری میں ان دنوں ایک دو نہیں کئی ایک شاعر ممتاز تھے۔ ان کی شہرت سخن شمالی ہند میں دور دور تک پہنچی ہوئی تھی ان کی غزلیں ارمغان کے طور پر لوگ شمالی ہند لے جاتے اور داد سخن دیتے تھے۔ امراء کی شعراء نوازی وغربا پروری نے شمالی ہند کے ایک نہیں بیسیوں شاعروں اور ادیبوں

کو اس زمانہ میں دکن کی خاک کا گرویدہ بنادیا تھا۔

مرزا علی لطف ۱۸۰۱ء میں گلشن ہند کی تالیف سے فارغ ہو کر حیدرآباد آئے اور نواب آصفجاہ بہادر اور اعظم الامراء ارسطو جاہ کی مدح میں قصائد لکھ کر گزارنے ان کی آمد کی شہرت ہوئی تو شعراء دکن نے معاصرانہ فراغ دلی سے کام لے کر استقبال کیا اور وہ حیدرآباد کے مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے اس زمانہ کے دکنی شعراء میں شیر محمد خاں ایمان بہت ممتاز تھے ان سے لطف کی اچھی راہ و رسم تھی سرکار عالی سے ازراہِ قدردانی چار سو روپیہ ماہوار اور ایک پالکی عطا ہوئی۔ اعظم الامراء نے ان کی بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر اپنے مصاحبوں میں شریک کر لیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔

لطف نے نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں ایک مرتبہ یہاں کے امراء کی ضرب المثل فیاضیوں کو دیکھ کر اضافہ کی درخواست کرتے ہیں اور اسی مشہور بحر میں جس میں مرزا غالب نے بہادر شاہ کے آگے اپنی استدعا پیش کی تھی ایک قصیدہ کہہ کر گزرانتے ہیں اس میں ارسطو جاہ کی غیر معمولی فیاضی اور نکتہ کو کتاب کے مول خریدتے اور پھر ناصر علی سرہندی کے ایک مطلع پر امیر الامراء ..... ذوالفقار خاں کی بے انتہا بخشش کا

ذکر کر کے کس حسن طلب کے ساتھ اظہار مدعا کیا ہے۔
ملاحظہ ہو۔

بخشش نے تیری رشک بیاباں کیا بحار
ہمت سے تیری غیرت دریا ہی کوہسار

ہو غرق موج آب گہر کشتی سپہر
عمان کف سے ہو تیری گر ابر مایہ دار

سائل ترے کے دھیان میں مژگاں مور کے
موہوم حسن حصول تمنا کا ہووے تار

تیرے کرم کے روبرو وہ رشتۂ عطا
حق الیقیں کے حبل متیں سی ہے استوار

ہووے اگر تو گرم تماشا بہ چشم فیض
سرسبز نار دن سے ہو گلریز کا انبار

اہل ہنر کو پرتو کلفت کی گرد میں
مانع نہ ہو سواد کا تیرے خط غبار

گر مہر قدر دانی میں تیرے نہ ہو فروغ
ہو روز علم آج شب جہل سے بھی تار

روز وغا نہیب سے تیرے صف عدد
برہم ہو باد تند سے جوں مور کی قطار

قبضہ کماں کا گر ترے آگے کرے حریف
ڈس جائے اس کا تیر وہیں اسکو بشکل مار

کیا خاک پھر بجھے لب زخم عدو کی پیاس
تر آب شور سے تری تلوار کی ہو دھار

قہر خدا ہے خود پہ دشمن کی تیری شمع
ٹھیرے ہے کب وہ کرے جگر گاہ سو گزار

یوں پشت زیں پہ ہے کے نکل آئے دیر تنگ
کہتے ہیں جوں عوام کہ صابن ہیں جیسے تار

تنہا نہ فرق مغفری اس پاس ہی کٹ دے
بازوئے جوشنی کو بھی سمجھے ہے ایک خار

زخم حمایلی سے گلے میں حریف کے
زیر کمر ہے .. جو اس نے ڈالا ہار

بھڑکیگا اپنے خون میں کیا خاک اسکا صید
اک سانس لے سکا نہیں جس کا کبھی شمار

اگر حریف اس کا پیادہ تھا دو ہوا
اور چار پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

ہے زیر ران تیرے جو وہ دیو پری جمال
کحل ضیائے چشم صبا جس کا ہے غبار

کہتا ہے یوں نسیم سے ہنگام جست خیز
گا ہے سبک عنانی ہجِ دریا پہ جوں حباب
آہن سم ایسا سنگ کہ سطح پہ تو فت جست
رنگ حنا میں دیکھے عرق یوں کفل پہ زیب
چھو جائے گر ہوا تک اس آتش مزاج کو
آباد اس کا خانہ زیں تجھ سے نت رہے
اے آبیارِ گلشنِ امید کامیاب
تجھ سا سخن شناس زسر تا بپا محک
ناصر علی وقت کہوں گر میں آپ کو
کبھوں گر کہ اس کے زادۂ افکار کا جگر
اور طبع نادیر میرے گر ہو سے حسود
بیزی جناب کو کہوں گر ذوالفقار خاں
ہر نکتہ دانیوں سے تری آئے دقیقہ سنج
اس پہ کہا ہے اس نے جو ناصر علی کے سائرہ
موقع تو ہے پڑھوں جو وہ مطلع حضور میں
اے شانِ حیدری ز جبیں تو آشکار
جز لفظ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات
آیکن قدر دانی میں لیکن برائے نام
ناصر علی کہاں ہیں کدھر ذوالفقار خاں

ٹھوکر سے . . . . . مفلوج رعشہ دار
وقتِ گراں کا بی ہو آتش میں جوں شرار
پرکار وار دم میں کرے دائرے ہزار
خوں کردہ جیسے عارضِ خوباں گل عذار
مشکل ہے پھر کہ لے کرۂ خاک پہ قرار
راکب کو ایسے چاہیے ایسا ہی راہوار
کھٹکے ہے دل میں نت ترے مدح کی خار
مجھ سا سخن تراش زپا تا بسر غبار
اس کا مجھے بجانِ سخن گر ہو افتخار
اکثر گرفت اہلِ معانی سے ہے فگار
انگلی رکھے تو کاٹے بہ دندانِ انکسار
ہر چند تھا وہ فخرِ امیرانِ نام دار
عنبر عنبر رکھتا تھا کب خان ذوالفقار
حاجت نہیں بیان کی زافرطِ اشتہار
جس پہ ہو ادہ معدنِ ہمت ہے زر نثار
نام تو در بزد کند کار ذوالفقار
ایسی کی ڈال دیویں پھر جس کے آگے یار
لازم یہی ہے کہ گیا جو خان با وقار
رطب اللسان ہے آج وہی نظم آبدار

نقشِ حجر ہے صفحۂ عالم پہ ان کا نام — ہو جائیں گو کہ مضمحل اوراقِ روزگار
اے ذرہ ہا ز نامِ تو خورشید اعتبار — تا نیر اسمِ اعظم از اسمِ تو آشکار
اس گفتگو سے مجھ کو اے ممدوحِ ذو الکرم — منظور عرض کرنا سخن کا ہے اقتدار
گر مدعا ہے اس سے تو حسنِ کلام ہے — حسنِ طلب کو دخل نہیں اس میں زینہار
کافر ہوں میں اگر مرے کچھ ہم و خیال میں — ایسی رکیک باتوں کو سہواً بھی ہو گزار
بلکہ صلہ کے نام سے مجھ پہ حرام ہے — لے ایک سے پچاس تک اور سو سے ہزار
کیونکر کہ شاعری مری میراث کچھ نہیں — نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار
فنِ سپہ گری میں وہ ہے کسب کونسا — جو جانتا نہیں میں بہ تائیدِ کردگار
پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب — کھل جائیگا وہ تجھ پہ کسی روز وقتِ کار
کل ہی کی بات ہے یہ مسافر وطن میں تھا — سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار
شکرِ خدا کے آج یہ یک ہنی و دو گوش — گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر ذرّہ خوار و زار
ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون — لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار
لابد ہے جبکہ جمع ہو خاطر بیان جو — طامع ہے در بدر جو پھرے پھر ذلیل و خوار
کنجِ خمول کو میں سمجھتا ہوں خانہ باغ — سیرِ بیاضِ شعر کو گل گشتِ سبزہ زار
کرتی جو کچھ کتاب ہے مجھ دل کباب سے — یہ غم ترا اشیاں نہ کرے یارِ غمگسار
تنہائی میں بھی خوش ہوں بہ تمکینِ قلندری — یارانِ پوست پوش یمن کے ملیں ما بیار
طولِ سخن گزر گیا حدِ ادب سے وائے — اطول ہوں اب کروں جو طوالت میں اعتذار
اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہو غرض — سو یہ ہے اے امیرِ فلک قدر دکے تبار
سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات — ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں | جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار
بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے | ہو کر سوار چھاتی پہ رہے جاتے ہیں کہار
خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی | ہیں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار
باقی جو سو رہے کئی دن ہیں زباں پہ بیر | شل مجردات فقط ان کا ہے شمار
بے زار ایک بھی جو لوں دشمن کے واسطے | بیزار جی سے ہوں تو . . . .
تجھ سا ہو قدرداں نکات اور نکتہ سنج | یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار
فضل و ہنر جو مجھ میں ہیں وہ سب پتے یکطرف | اور قدردانیاں بھی تری سب پہ یک شمار
آہن ہوں گر خشونت بخت سیاہ سے ہیں | کیدھر ہے یاد سے ترے کسریٰ کی یادگار
ہے ہمت بلند کا تیری جو اقتضا | اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار
از بسکہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے | بالفعل تو اضافہ کا ہونگا امیدوار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہوئے برائے نام | کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشودکار
تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف | کیونکر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں میرے تین سو | چھ سو جب اصول کو تو دے بلکہ چھ ہزار
یوں ہیں یقین کہ لوح جبین سوال کو | تزئین کرے ابھی ترا کلک قدرنگار
بس لطف اتنی بے ادبی تجھ سے ہے بعید | ہو ان نفس درازیوں سے اپنی شرمسار
دے شاہد دعا کو بس اب جلوۂ فروغ | چشم قبول کب سے ہے مکحول انتظار
جب تک جہاں میں نام بہار و خزاں رہے | او ابر تر ہو گلشن دنیا کا آبیار
باغ عمل عدو کا ترے نت رہے خزاں | اور گلشن امید ترا ہو سدا بہار

ارسطو جاہ بہادر سنہ ۱۷۹۷ء میں مدار المہام ہوئے اور سنہ ۱۸۰۴ء

میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد
ان کی جگہ نواب سر سالار جنگ اول کے جد امجد میر عالم بہادر کو قلمدان
وزارت سپرد کیا گیا۔ لطفؔ نے اپنی شیوہ بیانی سے میر عالم بہادر
کے یہاں بھی باریابی حاصل کی۔ انہوں نے بھی بڑی قدردانی کی
اور اپنی مصاحبت میں رکھ لیا۔ لطفؔ نے ان کی مدح میں بھی
کئی قصیدے لکھے ہیں۔

میر عالم بہادر چار سال وزارت کر کے سنہ ۱۸۰۸ء میں انتقال
کر گئے۔ اور ان کی جگہ ان کے داماد نواب منیر الملک دیوان ہوئے
اور سنہ ۱۸۳۲ء تک وزارت کے فرائض انجام دے کر وہ بھی
راہی ملک عدم ہوئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ لطفؔ ان کے یہاں
بھی باریاب ہوئے تھے یا نہیں اور اگر ہوئے تو انہوں نے
ان کی کیا قدردانی کی۔ لطفؔ کے موجودہ کلام میں کوئی قصیدہ ان
کی مدح میں نظر سے نہیں گزرا۔ غرض لطفؔ نے دکن کو اپنا وطن بنا
لیا تھا۔ وہ اور ان کے عزیز و اقربا یہیں سے ہو گئے تھے چنانچہ
صاحب گلزار آصفیہ کا جو ان کے معاصر اور رشتناسا تھے بیان ہے
کہ ان کے دو بھائی ایک مرزا علی رضا اور دوسرے حاجی مرزا
خاں حیدرآباد میں تھے۔ اور شہر میں سوزخوانی کرتے تھے
ایک نے طبعی موت سے انتقال کیا اور دوسرے چوروں کے
ہاتھ مارے گئے۔ لطفؔ نے سنہ ۱۲۳۸ھ م سنہ ۱۸۲۲ء میں وفات پائی۔

اور حیدر آباد ہی میں پیوند زمین ہوئے۔ گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن کے مولف ان کی خوش اخلاقی اور شیوہ بیانی میں رطب اللسان وہ لکھتے ...... ہیں کہ لطف خوش اخلاق پسندیدہ خصائل اور ظریف الطبع تھے۔ بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی میں بے نظیر تھے۔ اور محفل زیب و زینت یارانِ ہم مشرب کو آپ کی صحبت میں لطف و مزہ آتا تھا۔ لطف گو دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی عمر کا ایک حصہ شمالی ہند میں بھی بسر ہوا تھا مگر ان کی شاعری کا عروج دکن میں ہوا اور وہ بالآخر خود بھی اس دامنگیر سرزمین میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ ایسے افراد جو اپنے مولد کو چھوڑ کر کسی دوسری سرزمین پر آ بسیں اور اسی کے ہو رہیں وہ مستحق ہیں کہ اس ملک کے افراد میں شمار کیے جائیں۔ توطن دائمی سے اس ملک کے ساتھ ان کو جو ہمدردی و انس ہو جاتا ہے اس کے مد نظر وہ وہیں کے باشندے قرار دیے جانے چاہیں۔ لطف نے فورٹ ولیم کالج اور دکن سے اپنے اس تعلق کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

ہوا آوارہ ہندوستان سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

کلیات لطف لطف کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین اور مؤلف محبوب الزمن کی رائے نہایت عمدہ

ہے وہ ان کی شستگی پختگی کلام کے معترف اور شیرینی و رنگینی کے مداح ہیں۔ لطف نے غزل قصیدہ اور مثنوی غرض جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان کا کلیات افسوس ہے کہ لاپتہ ہے۔ مولوی غلام محمد صاحب وفا مالک تاج پریس حیدرآباد کے ہاں "دیوان منتخب" کے نام سے لطف کے کلیات کا نہایت ہی معتبر اور نفیس انتخاب قلمی نسخہ کی صورت میں نظر آیا۔ موصوف کے نسخہ ہی سے ہم نے مندرجۂ بالا قصیدہ نقل کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

"تذکرہ گلشن ہند" میں انہوں نے اپنے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ نقل کر دیا ہے جو خود ان کا اپنا انتخاب کیا ہوا ہے اور ان کے کلام پر رائے زنی کرنے اور اس کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔ بعض متاخرین نے ان کے کلام کو سرے سے بے لطف بتایا ہے مگر یہ انصاف کا خون کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام ادبیات عالیہ اور درجہ اول کا نہیں کہا جا سکتا تاہم اس میں ان کے اپنے دور کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ کلام میں ہمواری و روانی ضرور ہے ان کے قصیدے نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ خوبی سخن کے لحاظ سے بھی کچھ برے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے آعظم الامراء کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں ناصر علی کا ذکر کر کے

تعلی کی ہے مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اُردو کے اکثر شعرا نے فارسی کے استادوں کے نام لے کر بڑی بڑی تعلیاں کی ہیں اور گو ان میں سے بعض واقعی قابل فخر تھے، مگر اکثر تعلیاں تو سراسر بیجا ہیں۔ ہم ان کے قصیدوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی غزلیں واقعی پھیکی ہیں۔ اور ان میں کوئی ایسی خاص خوبی بھی نہیں کہ ان کو بلند پایہ شاعر ثابت کر سکے مگر قصیدوں میں انہوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں اور طرز ادا۔ صفائی و رنگینی کے اعتبار سے وہ اُردو کے اچھے قصیدہ گوؤں میں شمار ہونے کے مستحق ہیں۔ قصائد کا نمونہ اوپر آچکا ہے۔ غزلیات میں سے ایک غزل مشتے نمونہ از خروارے یہاں درج کی جاتی ہے

جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے — دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے
اللہ رے قید خانۂ ہستی کے دم کے ساتھ — ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے
رویا ہوں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار — تھے جا بجا گل درخت مغیلاں لگے ہوئے
بارے چھٹے اسیر بلا اس گلی میں آج — ہیں تو وہ بارے گنج شہیداں لگے ہوئے
بیمار کا تو تیرے کھلا حال بعد مرگ — سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے
رکھ موج کم قدم مری وادی میں گر ہو یاد — پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے
کوئی تو میرے ناصح دانا سے یہ کہو — دل چھوٹتے ہیں باتوں ناداں لگے ہوئے
کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثل زلف — کانوں سے اس کے ہم سے پریشاں لگے ہوئے

گلشن ہند لطف کا کلیات تو جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ بالکل نایاب ہے البتہ ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے جس سے رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے اور یہ تذکرہ "گلشن ہند" ہے۔ یہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ترتیب دیا گیا ہے۔

لطف نے اپنے دیباچہ میں اپنی عادتی مدح سرائی کے ساتھ بیان کو طوالت دیکر اس کی وجہ تالیف اور تاریخ لکھی ہے ہم اپنے مقصد کے لیے اس کا صرف ضروری حصہ نقل کر دیتے ہیں۔

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے اپنے تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ سنہ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار چارسو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب مسٹر گل کرسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جاوے تو خوب ہو اور ہر ایک شاعر کی پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت مرغوب ہو، ہندی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نومشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی میرزا علی

کو کہ لطف تخلص کرتا ہے نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ تو نثر و ہی اس مقدمہ میں کرے تو ہم اس تذکرہ کو اپنی طرز پر لکھیں اگرچہ یہ پابند الفت کا ان ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لا کھ جان سے حاضر ہوں ...... غرض مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم ان کی تربیت کے لیے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں تا کہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت بخوبی اس سے مزہ اٹھائے تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جن کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ایسا جس کو نو مشق پڑھ کر کہیں واہ واہ ...... الحمد اللہ آج کے دن کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں ...... کہ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے .... اب ہیچدان نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے "گلشن ہند" رکھا ہے۔

دیباچہ کے آخر میں مزید احتیاط کی خاطر یہ قطعہ تاریخ بھی دیا ہے ؎

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا
کہتا ہے یوں خزاں سے تو کیا پلشت ہے
حیران پھرے ہیں بے سر و پا بہمن اور دے
تاریخ اسکی جب سے کہ رشک بہشت ہے
(۱۲۱۵ھ)

لطف کا تذکرہ علی ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم کا ہرگز ترجمہ نہیں (۱۸۰۱ء) بلکہ لطف نے اس تذکرہ کو پیش نظر رکھ کر اس کی بنیاد پر اپنے تذکرہ کی تدوین کی ہے۔ یہ ان کی مستقل تالیف ہے اور اس میں بہت سی باتیں اپنی چشم دید اور محققانہ طور پر لکھی ہیں۔ یہاں ہم مختصر طور پر علی ابراہیم خاں اور گلزار ابراہیم کا ضمناً تھوڑا سا حال لکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

علی ابراہیم خاں صوبہ بہار کے ایک معزز رئیس اور نواب امین الدولہ نصیر جنگ کے خطاب سے مفتخر تھے۔ ان کا مولد و وطن اعظیم آباد پٹنہ ہے وہ فارسی کے ایک کہنہ مشق شاعر اور بلند پایہ استاد تھے ان کے تبحر علمی اور مذاق شعر کا اندازہ ان کی تصنیفات سے بخوبی ہو سکتا ہے نام کی مناسبت سے خلیل تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے کوئی دس بارہ سال کی محنت سے سنہ ۱۱۹۸ھ میں تذکرہ گلزار ابراہیم مرتب کیا ان کی دوسری تصنیفات میں قابل ذکر (۱) خلاصۃ الکلام (۲) صحف ابراہیم (۳) وقایع جنگ مرہٹہ (۴) حالات سرکشی بنارس اور

(۵) مجموعہ خطوط ہیں پہلی دو کتابیں شعرائے فارسی کے مبسوط تذکرے ہیں تیسری کتاب وقایع جنگ مرہٹہ ۱۲۰۰ھ کی تالیف ہے اور اس میں ۱۱۷۱ھ سے لے کر ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں اور یہ مرہٹوں کے عروج وزوال کا صحیح مرقع ہے پانی پت کی تیسری جنگ کا حال جس میں احمد شاہ درّانی نے مرہٹوں کو نہایت زبردست اور حوصلہ شکن شکست دی تھی۔ ایک ایسے شخص سے لے کر بیان کیا ہے کہ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ جنگ دیکھی تھی۔ چوتھی کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے بغاوت کے حالات لکھے ہیں اور پانچویں ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اس سے اس زمانہ کے بعض حالات پر نہایت بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ان کی عدالتی قابلیت کے مدنظر ان کو بنارس کا صدر ناظم فوجداری مقرر کیا تھا اور اسی شہر میں ۱۲۱۸ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوؤں میں مجرمین کی غلطی آزمائش لڑ ایبل بائی آرڈیل کے مروجہ طریقوں پر بھی ایک محققانہ رسالہ سپرد قلم کیا تھا مگر ان سب تالیفات میں ان کا تذکرہ ان کی بہترین یادگار اور اردو کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر چیز ہے اس میں تقریباً تین سو شعرائے اردو کے مجمل حالات فارسی میں لکھے ہیں اور ان کے کلام

کے نمونے دیے ہیں۔ اس کو مصحفی اور شیفتہ وغیرہ کے تذکروں پر تقدم کا فخر حاصل ہے حال ہی میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب نے اس کو باہتمام انجمن ترقی اردو سے شایع کیا ہے ساتھ ہی گلشن ہند بھی شریک کر دیا ہے۔

لطف نے اس تذکرہ کی بنیاد پر اپنے تذکرہ کی عمارت کھڑی کی ہے۔ "گلشن ہند" کی اصل میں دو جلدیں ہیں ایک مشاہیر شعرا کے متعلق اور دوسری غیر معروف شعرا کے حال ہیں۔ خود مؤلف نے دیباچہ میں اس کی صراحت اس طرح کی ہے "گلشن ہند کی دو جلدیں ہیں جلد اوّل پر جو تحریر کی جاتی ہے اس میں عرش کی پروازیاں سلاطین نامدار کی اور گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی اور خوش استعدادیاں امرائے عالی مقدار کی اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی جو کہ نام آور صاحب دیوان تھے بیان کی گئی ہیں۔ جلد دوم میں مذکور کیے گیے ہیں۔ شعرائے گمنام وغیر مشہور یا تو مشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔"

لطف کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد بھی لکھی جا چکی ہے مگر یہ اب تک بالکل ناپید ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانے اور ذخائر ادبیات مشرقیہ جہاں جلد اول کے قدیم نسخے موجود ہیں اس سے خالی

ہیں کاش یہ جلد بھی پہلی کی طرح کسی باخیر اور علم دوست شخص کے ہاتھ آجاتی اور وہ اس کو شایع کر کے اردو ادبیات میں ایک گراں قدر اضافہ کر دیتا۔

جلد اول جو اس وقت ہمارے پیش نظر اور عام طور پر شایع و رائج ہے (۶۹) شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ غالبًا اس کا اب تک ایک ہی ایڈیشن شایع ہوا ہے اور وہ مولوی عبداللہ خاں صاحب سابق منتظم کتب خانہ آصفیہ کا شایع کردہ ہے اس کی اشاعت کا قصہ بھی عجیب دلچسپ ہے۔ حیدرآباد میں ۱۹۰۸ء عیسوی کی بڑی طغیانی کے حادثہ قیامت نما کے تین چار سال قبل بھی رودِ موسیٰ میں طوفان ہوا تھا اس سیلاب میں کسی آفت زدہ کا کتب خانہ بھی برباد ہوا اس کی آب آورد کتابیں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں ان میں سے یہ تذکرہ ایک صاحب غلام محمد مددگار مجلس کا بینۂ حیدرآباد کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کو علامہ شبلی نعمانی کو دکھایا علامہ موصوف نے اسکی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے اس کو انجمن ترقی اردو سے شایع کرانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر انجمن تو اس کو شایع نہ کر سکی البتہ ان کی تحریک سے عبداللہ خاں اس کی اشاعت پر مستعد ہو گئے۔ اور نہایت اہتمام کے ساتھ علامہ شبلی کے تحشیہ و تصحیح اور مولوی عبدالحق صاحب کے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ

سنہ ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ مقدمہ میں مولوی عبد الحق صاحب نے فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس تذکرہ کی خوبیاں گنائی ہیں یہ ایڈیشن سنہ ۱۲۳۵ھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے مرتب ہوا ہے۔ یورپ کے مشہور کتب خانوں میں "گلشن ہند" کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بھی تذکرہ گلشن ہند کے تین نسخے محفوظ ہیں ان میں سے ایک نہایت قدیم بسیط ہے۔ عبد اللہ خاں کے مطبوعہ نسخے میں افسوس ہے کہ بعض بے جا تحریفیں ہوئی ہیں۔ کتاب کا حجم کم کرنے کے خیال سے لطف اور چند شاعروں کے نمونۂ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا۔

جہاں تک ہمیں اس وقت معلوم ہو سکا ہے شمالی ہند کے شعراء میں سب سے پہلے میر تقی میر نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا ہے یہ ان کے قیام دہلی کی تالیف ہے۔ مگر اس کا سنہ تالیف کسی تذکرہ نویس بلکہ ناشر تذکرہ نے بھی نہیں لکھا مرزا سودا سے بھی ایک تذکرہ منسوب کیا جاتا ہے مگر یہ بالکل ناپید ہے اور صرف مولانا آزاد کی زبانی اس کا نام ہی نام مشہور ہو گیا ہے۔ کم و بیش ہیں سنہ میں گلشن گفتار اور تذکرہ گردیزی بھی لکھے گئے پھر نکات شعرا، گلزار ابراہیم تذکرۂ

مصحفی اور تذکرۂ میر حسن وغیرہ نایاب ہوئے ان تذکروں میں سے سوائے گلشن گفتار مولفہ خواجہ خان حمید کے باقی تمام تذکرے مولوی عبدالحق صاحب کی حسین توجہ سے انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیے ہیں۔ ان تذکروں میں شعراء کے حالات نہایت ہی اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان استادوں کی نظر انتخاب نے کلام کا نمونہ دینے میں بھی اپنے بلند پایہ مذاق سخن سے کام لے کر بہت ہی کم اشعار نقل کیے ہیں۔ البتہ کلام کے متعلق ان کی رائیں اور بعض قدماء و معاصرین کے متعلق ان کے بیانات قابل استنادیہ اور یہی ان تذکروں کی خصوصی شان ہے۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ بھی اپنی جگہ خاص طور پر اہم اور مفید مطلب ہے۔ لطف نے چونکہ اس کو انگریزوں کی نگرانی میں کم استعداد لوگوں کے مطالعہ و استفادہ کے لیے تحریر کیا ہے۔ اس لیے دوسرے متقدم تذکرہ نویسوں کے مقابلہ میں شعراء کے حالات زندگی بیان کرنے میں کسی قدر وسعت سے کام لیا ہے مگر پھر بھی جیسا چاہیے حالات پھیلا کر نہیں لکھے تاہم جو کچھ لکھا ہے غنیمت ہے۔ اس زمانہ کے لوگ حالات زندگی بیان کرنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لطف نے اکثر اساتذہ سخن کی آنکھوں دیکھی تھیں اور خود ان کا زمانہ بھی اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے اکثر معاصرین اور اساتذہ کے

متعلق ان کے بیانات نہایت معتبر اور قابل سند ہیں اپنے پیش رو تذکرہ نویسوں کے برخلاف لطفؔ نے بعض شعراء کے حالات میں جن کا تعلق تھوڑا بہت دربار سے بھی تھا۔ تاریخی واقعات بھی خوب لکھے ہیں۔ مثلاً شاہ عالم آفتابؔ۔ آصف الدولہ آصفؔ اور امیر خاں عمدۃ الملک انجامؔ کے ضمن میں تاریخی واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اس زمانہ کی معاشرت اور سوسائٹی کا صداقت آمیز نقشہ کھینچا ہے۔ یہ بات اکثر تذکروں میں مفقود ہے۔ اور یہی گلشنِ ہند کی امتیازی شان ہے۔

اس تذکرہ میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو ایک عرصہ تک بالکل نامعلوم تھیں۔ مگر اب اس کے علاوہ دیگر کتابوں کے ذریعہ عام ہو چکی ہیں۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی گلزارِ ارم جس کا ذکر صرف مولانا آزاد نے کیا تھا اور ایک عرصہ تک مشتاق نگاہیں اس کی متلاشی تھیں، اس کے وہ اشعار جن میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی مذمت ہے اس تذکرہ میں موجود ہیں۔ مگر اب یہ مثنوی مخزنِ مرحوم کے لائق مدیروں کی حسن سعی سے شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح میر اثرؔ کی مثنوی خواب وخیال جس کی ایک زمانہ سے صرف تعریف ہی تعریف سنتے آئے تھے۔ اس کا بھی ایک حصہ اس میں دیا ہوا ہے۔ مگر حال ہی میں اصل مثنوی انجمن ترقی اردو کی جانب سے شایع ہو گئی ہے۔ قدیم

شعرائے دکن میں مؤلف نے ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ)
کو بھی شاعر بتایا ہے اور علی ابراہیم خاں کے حوالہ سے یہ شعر ان
کی طرف سے منسوب کیا ہے ؎

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بچھراٹ ہے
ایک بات کے ہونگے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

"جی بارہ باٹ ہونا" دکن کا ایک قدیم محاورہ ہے اور کچھ
عجب نہیں کہ یہ شعر انہیں کا ہو کیونکہ لچھمی نارائن شفیقؔ اور دیگر
دکھنی تذکرہ نویسوں نے بھی یہ شعر انہیں سے منسوب کیا ہے۔

لطف نے بعض موقعوں پر نہایت سفید جھوٹ لکھا ہے۔
تانا شاہ کے ذکر میں مکہ مسجد حیدرآباد کی بیخ کنی کا الزام اورنگ
زیب عالمگیر پر نہایت دریدہ دہنی سے لگایا ہے اور لکھتے ہیں
"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا
اور مکہ مسجد کھدوا کے جو کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا" خدا
جانے اس حرکت سے کیا مفاد ہے" یہ عالمگیر پر نرا اتہام ہے۔
اسی طرح انہوں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب بیجا سے حضرت شاہ
ولی اللہ صاحب اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ
کی ہجو ملیح کی ہے اور اول الذکر پر منافب معاویہ و البطال
شہادت حسینؓ میں ایک کتاب لکھنے کی تہمت باندھی ہے یہ بات
تذکرہ نویس کی شان کے منافی اور نہایت معیوب حرکت ہے۔

ہم کو لطفؔ کے معتقدات اور تعصب پر اس وقت کچھ لکھنا مقصود نہیں۔ صرف یہ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے بعض بیانات میں صداقت بھی ہے اور بعض میں کذب و افترا بھی۔

مرزا علی لطفؔ کی زبان گنجلک اور تعقید سے معمور ہے وہ قافیہ پیمائی کے اس قدر عادی ہیں کہ گویا سیدھی عبارت لکھنا ہی نہیں جانتے جو عبارت لکھی ہے مقفیٰ و مسجع جو بات بیان کی ہے تشبیہ و استعارہ کے انداز میں۔ باوجودیکہ یہ تذکرہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے لکھا گیا ہے۔ اور خود اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کے لکھوانے کا مقصد ولایت کے تازہ وارد انگریزوں کو اردو سکھانا اور آسان طرز بیان کی کتابوں کا ذخیرہ بڑھانا ہے مگر وہ اپنا مخصوص انداز بیان نہ چھوڑ سکے اور فارسی عربی الفاظ کے بکثرت استعمال سے کتاب کو بتدیوں کے لیے عسیر الفہم بنا دیا ہے۔ لطفؔ گو دہلی کے باشندے ہیں اور وہیں تربیت پائی رہے مگر ان پر عربی فارسی کا رنگ بے حد غالب ہے وہ محاورے اور روزمرے کے استعمال پر تشبیہ و استعارہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی زبان بہت قدیم ہے اور میر و سودا کے کلام میں جو قدیم الفاظ موجود ہیں اور جن کو اب بالکل ترک کر دیا گیا ہے ان کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اور بڑی بے تکلفی سے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی

نثر میں جا بجا اس کی مثالیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "شورش تخلص متوطن عظیم آباد کے مشہور میر پہنا گر گئے تھے" میر و سودا کے کلام میں میں کہا بجائے ہیں نے کہا کے اکثر جگہ پایا جاتا ہے دکن میں بھی ایک زمانہ تک اسی طرح کہتے تھے بعض موقعوں پر فعل متعدی میں فعل کو بجائے معمول کے فاعل کے لحاظ سے لکھا ہے جیسے "دلی سے جبکہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا ٹھہرائے" غرض ان کی زبان میں ایسے بہت سے متروکات پائے جاتے ہیں جو قدما کے کلام کی یادگار ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے مولفین میں ایک مولوی امانت اللہ کی زبان پر عربیت کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ صاف اور شستہ عبارت ان سے سرانجام نہیں ہوسکتی اور دوسرے نے اعلی لطف کہ سیدھی سادی اُردو لکھنا عیب سمجھتے اور ہر وقت رنگینی کے ساتھ مقفٰے و مسجع عبارت کا التزام رکھتے ہیں ان دونوں کے سوا اس کالج کے تمام مولفین صاف اُردو نویسی میں مشاق اور ممتاز ہیں زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے تذکرۂ گلشن ہند ایسی چیز نہیں کہ اس کو مقبولیت عام حاصل ہو سکے یہ محض ایک تاریخی کتاب اور شعرائے اُردو کے حالات میں ایک گراں قدر تذکرہ ہونے کی وجہ سے اُردو ادبیات میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر لطف اس زبان میں کوئی قصہ لکھتے یا کسی کتاب کا ترجمہ کر لیتے تو یقیناً طاق نسیان کی نذر ہو جاتا

اور اس کو ہرگز مقبولیت نصیب نہ ہوتی۔ نمونۃً قایم چاندپوری کے حالات جو بہت ہی مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں نقل کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مولف نے سیدھی سادی باتوں کو کس پیرایہ اور کس التزام کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام، مستوطن چاندپور ندینہ (غالباً یہ نگینہ ہوگا) کے نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی ابندی میں معروف، کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انھوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے راقم آثم کو نو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال کے خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے صفائے بندش سے اس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی اور

موج زنی اس طبع معانی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی افسوس ہے ایسے شخص کا اس جہان فانی سے اٹھ جانا اور داغ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید ۱۲۱۰؁ھ میں اُدھر ہی نوائے وطن میں اپنے اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی۔ اور عجب طرح کی ایذا جان اہل معانی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اس سخنور کے کلام سے نہیں رہی ہے لیکن رغبت طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے۔

مولوی امانت اللہ

مولوی امانت اللہ فارسی اور عربی کے ایک جیّد عالم تھے۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں ملازم اور عربی فارسی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور رہے تھے ان کے حالات زندگی اور تاریخ پیدائش و وفات وغیرہ باوجود کوشش کے حاصل نہ ہو سکے کسی صاحب تذکرہ نے ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ان کا وطن کونسا شہر تھا اور وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمالی ہند کے باشندے تھے اور غالباً صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے کسی شہر میں رہتے تھے ان کی کتاب "جامع الاخلاق" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ مگر وہ بھی ان کے حالات پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہے اس کے دیباچہ میں ایک ذیلی عنوان "کتاب کے ترجمہ اور مصنف کے احوال کا بیان۔" موجود ہے مگر اس میں بھی انہوں نے صرف اپنا نام لکھ کر بتایا ہے کہ جامع اخلاق کس کے ایما سے لکھی گئی اور اس کے سوا کچھ نہیں لکھا افسوس ہے کہ ایسے باکمال شخص کے ذکر سے ہمارا سرمایہ تذکرہ و تاریخ خالی ہے اور اب تک کسی مصنف نے ان کا حال بیان نہیں کیا۔

اس وقت ان کے متعلق جو کچھ بھی معلومات ہو سکتی ہے وہ صرف انہی کی کتابوں کے متفرق بیانوں سے اخذ کی جا سکتی ہے مگر ان کی مولفات بھی پوری طرح حالات پر روشنی نہیں ڈال سکتیں جس سے مجبوراً حالات زندگی سے قطع نظر کرنی پڑتی ہے۔ مولوی امانت اللہ کی حسب ذیل (۵) کتابیں ہیں۔ (۱) ہدایت الاسلام عربی (۲) ہدیۃ الاسلام اردو (۳) جامع الاخلاق (۴) صرف اردو منظوم (۵) ترجمہ قرآن مجید۔ ان میں سے اول الذکر دو کتابیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے مذہب اسلام سے متعلق ہیں اور ان میں اسلام کے ارکان اور معتقدات کا تفصیل وار ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ان کی پہلی تالیفات ہیں اور جامع الاخلاق کے ایک بیان سے جس کو ہم آگے نقل کرنا چاہتے ہیں ان کتابوں کا سب سے پہلے تالیف ہونا ثابت ہے مولوی امانت اللہ نے تکمیل علوم کے بعد سب سے پہلے اپنے مبلغ علم سے کام لے کر عربی میں ہدایت الاسلام تالیف کی۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کی دو جلدیں بیان کی جاتی ہیں اس کتاب سے عامۃ المسلمین جو عربی سے نابلد تھے کما حقہ، فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے اور اس کا استفادہ صرف خواص تک محدود تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں فورٹ ولیم کالج قایم ہو چکا تھا اور وہاں اردو نثر نویسوں کی خوب قدر و منزلت کی جا رہی تھی۔ اس خیال نے مولوی امانت اللہ کو بھی اردو نثر نویسی کی

طرف متوجہ کیا اور انہوں نے بجائے کسی اور کتاب کا ترجمہ کرنے یا کوئی دوسری تالیف مرتب کرنے کے اپنی ہی عربی کتاب کو اردو میں لکھنا شروع کیا۔ اس سے ایک طرف ان کی عربی کتاب سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہو گیا تو دوسری طرف انہوں نے اپنی اردو نثر نویسی کا ایک نمونہ بھی مرتب کر لیا۔ جب اردو ہدایت الاسلام کی پہلی جلد تیار ہو گئی تو اس کو ڈاکٹر گلکرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا اس کے مطالعہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ پر ان کے تبحر علمی کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو خاص عربی اور فارسی کی ادق کتابوں کے ترجمہ کے لیے کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم رکھ لیا۔

ہدایت الاسلام

سنہ ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی حسن سعی سے ہدایت الاسلام کی جلد اول کالج کی جانب سے شایع ہوئی اور خود انہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ہدایت الاسلام کا یہی ایک ایڈیشن نکلا تھا بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں یہ نسخہ محفوظ ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

> فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں:۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبے کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے اور کعبہ کے اوپر

مکہ وہ ہے اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو
بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک
ہو صحیح ہے۔ پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اسی
طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو
اس کی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام
سے آگے ہو جاوے گا اور مقتدی کو اپنے آگے کھڑا ہونا
درست نہیں ہے۔" ہدایت الاسلام صـ۹۳

ترجمہ قرآن شریف کالج کے شعبہ تالیف و تراجم میں ملازم
ہو کر مولوی امانت اللہ نے ہدایت الاسلام
کی دوسری جلد کا ترجمہ تمام کیا اور پھر ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے
میر بہادر علی حسینی کے ساتھ قرآن شریف کا اُردو ترجمہ کرنے لگے
مگر ابھی اس کام کو شروع کیے ہوئے چند ہی روز گذرے
تھے کہ ۱۸۰۳ء کے اواخر ایام میں ڈاکٹر گل کرسٹ خرابی
صحت کی وجہ سے وظیفہ حسن خدمت پر کالج سے سبکدوش
ہو گئے اور انہیں مولوی امانت اللہ کی سرپرستی کرنے اور
ان سے کوئی مفید تالیف یا ترجمہ کرانے کا خاطر خواہ موقعہ نہ
ملا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی علیحدگی کے بعد ہی ان کے جانشینوں
نے قرآن شریف کے ترجمہ کے کام کو موقوف کرا دیا اور اس
طرح یہ مفید کام ادھورا رہا۔ قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے

ابتداءً یہی دو صاحب مقرر ہوئے تھے مگر زاں بعد ان کی امداد کے لیے کالج کے بعض اور مولوی بھی اس کام پر مامور کیے گئے۔ گلکرسٹ کے جانشینوں نے ترجمہ شدہ حصّہ کو بھی کالج کی طرف سے شایع کرنا پسند نہ کیا اور کالج کی مطبوعات اس سے خالی ہیں حسنِ اتفاق سے مولوی امانت اللہ کے ترجمہ کو جو سورہ فیل سے آخر قرآن مجید تک ہے۔ اشاعت کا موقع مل گیا اور بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ دریافت ہوا ہم نے اس کا اقتباس حاصل کر لیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود انہوں نے یا کسی اور شخص نے جس کو کالج سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس کو شایع کیا ہے۔

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا مگر زمین میں مگر خدا ہی پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھیراؤ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے اور وہی تو وہ خدا ہے جس نے بنا ڈالا... آسمانوں کو زمین کو چھ دن میں، اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے اور اگر کہتا ہے تو ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ اور اگر دیر لگاویں ہم ان کے عذاب میں گنتی کے کچھ زمانوں تک کہنے لگے

ہیں کہ کس نے روک رکھا ہے۔ آگاہ ہو کہ جس دن آپڑے گا وہ ان پر تو نہ ہٹایا جائیگا ان سے اور گھیرے گا انہیں وہی عذاب کہ جس پر ہمیشہ وہ ٹھٹھے لگایا کرتے تھے اور چسکا لگا دیتے ہیں۔ ہم آدمی کو اپنی رحمت کا۔ پھر چھین لیتے ہیں اس سے تو ضرور وہ......

اور نہ بڑا ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر چکھا دیتے ہیں ہم ان سے نعمتیں ضرر وں کے بعد وہ ضرر کہ چھو جاتے ہیں اسے تو کہنے لگتا ہے کہ گئے گذرے ہوئیں سب برائیاں مجھ سے اور ضرور وہ بہت مگن اور بڑا ہوتا ہے مگر وہی لوگ کہ جو جھیل جاتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں جو کچھ کام تو انہیں کے لیے تو بخشش اور بہت کھری مزدوری۔" (ترجمہ قرآن مجید ص ۲۶۹)

جامع الاخلاق قرآن شریف کے ترجمہ کو موقوف کر کے کپتان جیمس مونٹ نے جو ڈاکٹر گل کرسٹ کی جگہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے مولوی امانت اللہ سے فارسی کی مشہور اور معرکتہ الآرا کتاب اخلاق جلالی کو جس کا اصلی نام "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" ہے اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں کتاب کے ترجمہ اور مصنف کے احوال کا بیان کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ دولت خواہ سرکار فیض آثار کمپنی بہادر دام اقبالہٗ شیخ امانت اللہ مترجم تفریق ہندی مدرسہ کا ہے، جب اس بندے نے نسخہ ہدایت الاسلام سے فراغت کی اور صاحب ممدوح (یعنی کپتان جیمس مونٹ) کی خدمت میں اظہار کیا ارشاد ہوا کہ تو اخلاق جلالی کا ترجمہ زبان ریختہ میں کر۔ اگرچہ یہ کتاب بغایت مغلق اور دقیق المضمون اوّل سے آخر تک تمام مسائل حکمی۔ اور تدقیقات علمی سے مشحون ہے اور ترجمہ کرنا اس کا مستلزم تجرید مادۂ جسمانی اور اسقاط قوائے انسانی کا ہے۔ لیکن بمقتضائے نمکخواری کے صورت انکار کی مناسب نہ دیکھی اور فضّال حقیقی پر توکل کر کے اس میں اقدام کیا لیکن اس کے خطبہ کے بدلے دوسرا خطبہ علیحدہ کہہ کر ضمیمہ اس ترجمہ کا کر کے حکمت عملی کی تقسیم سے شروع کیا اور حتیٰ المقدار اس کی تسہیل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر ان اصطلاحوں کا جن کا ترجمہ اس زبان میں ممکن نہیں انشاء اللہ تعالیٰ بعد اتمام کے ان اصطلاحوں کی تفسیر اشارے وکنائے سے کر کے جلدی ایک فرہنگ مختصر تخمیناً بمقدار دو تین جزو کے آخر کتاب میں ملحق کی جائے گی جس کسی کو کسی لفظ میں شبہ ہو تو اس فرہنگ میں دیکھ لیوے اور جابجا کمی زیادتی کر کے ترجمہ لفظی چھوڑ سہل ہونے کے لیے مطلب بیان کر دیا ہے۔ پر ترتیب اس ترجمہ کی بہ اعتبار ابواب وفصول کے مطابق اصل کتاب

کے باقی رہی نام اس کا جامع الاخلاق رکھا۔"

جامع الاخلاق کی ترتیب ۱۸۰۵ء کے وسط میں ختم ہوئی خاتمۃ الکتاب میں اس کی تاریخ اختتام ترجمہ کی مشکلات اور اپنی محنت شاقہ کا ذکر ان الفاظ میں کتاب ہے۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء م ۱۲۲۰ھ کو بہت محنت و نفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالیشان کے اقبال کی برکت سے اس ہیچمدان نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کے ترجمہ سے فراغت کی دلیکن داناؤں کے نزدیک پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے لالی مطالب کو جو عبارت فارسی کے صدف میں پنہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس کس طرح سے غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتہ تحریر میں پرو کر ریختہ زبان کے اردو بازار میں لا حاضر کیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"جاننا چاہئے کہ ترجمہ سے فراغت کرنے کے بعد بعضے دوستوں نے تکلیف دی کہ تاریخ اتمام کی اگر اس میں منظم ہو تو بطور یادگار کے رہے میں نے بھی اس کو مناسب جان کر تاریخ ہجریہ میں یہ قطعہ کہہ کر یہاں لکھ دیا۔

ترجمہ سے جب ہوا فارغ   فکر تاریخ طبع پر تھی شاق

دور کرتیغ علم سے سر جہل بولا ہاتف "تمامی اخلاق"

جامع الاخلاق ہی مولوی امانت اللہ کا وہ واحد کارنامہ ہے جس کی بدولت ان کا نام اُردو ادبیات میں باقی ہے۔ اخلاق جلالی سی اہم اور ادق کتاب کا ترجمہ کر کچھ آسان کام نہ تھا اور مولوی امانت اللہ نے اس کو محنت سے انجام دے کر اُردو کے ادیبوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ اس کی تکمیل کے بعد اس کو فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل کر لیا گیا اور اس ضرورت سے اس کے دو تین ایڈیشن شایع ہوئے مگر یہ کتاب کچھ بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی اس کا سبب اوّل تو یہ ہے کہ اس کا موضوع نہایت خشک اور ادق ہے ہر کس و ناکس اس کے سمجھنے اور اس کے مطالب عالیہ تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ مصنف نے اخلاقیات پر جو فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اس نے اس کتاب کو اور بھی مشکل بنا دیا۔ اور یہ خالص علمی کتاب ہو گی۔ عوام اس سے کسی طرح خاطر خواہ دل چسپی نہیں لے سکتے تھے البتہ خواص کی توجہ کے لایق تھی اور رہے۔ وہی اس کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی امانت اللہ نے اگرچہ مضمون کو سہل بنانے اور آسان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ اپنی کوشش

میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ اوّل تو ان کی زبان مولویانہ ہے۔ عربیت کا اس قدر غلبہ ہے کہ سیدھی سادھی عبارت نہیں لکھ سکتے پھر اس پر اخلاق جلالی کا طرزِ بیان بھی جیسا کچھ ادق ہے مشہور ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمہ میں اصل فارسی کے موٹے موٹے الفاظ و لغات کو بہت بڑی حد تک باقی رکھا اور اسی کو انشاپردازی کا جوہر سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبارت میں تعقید اور گنجلک پیدا ہو گئی اور جملے طولانی ہو گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے جتنے بھی اہلِ قلم تھے ان سب کی زبان ان کے مقابلہ میں سلیس اور صاف ہے اگرچہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ترجمہ میں آزادی سے کام لیا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ اکثر و بیشتر موقعوں پر اصل فارسی طرزِ بیان کی کورانہ تقلید کی ہے اور عبارتوں کو اسی ترکیب کے ساتھ اردو میں منتقل کر لیا ہے جس کی وجہ سے ساری کتاب تعقید سے مملو ہو گئی ہے۔ اور عام فہم نہ رہ سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاق جلالی کا ترجمہ اس قدر آسان اور صفائی کے ساتھ ممکن نہیں جس طرح اخلاق محسنی یا گلستاں کا ہو سکتا ہے مگر مولوی امانت اللہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا کہ وہ اس ادق کتاب کو جب اردو کے قالب میں ڈھال رہے تھے تو اتنی سلیس اور عام فہم بنا دیتے کہ خاص و عام سب اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے یہ مراد

نہیں ہے کہ مضمون کی سنجیدگی کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ سنجیدگی مضمون کے ساتھ اگر سلاست بیان اور زبان کی روانی کو ملحوظ رکھا جاتا تو یہ مقصد بخوبی حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے عالم متبحر تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان پر علوم قدیمہ اور زبان عربی کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ وہ ٹکسالی زبان نہیں لکھ سکتے تھے ان کے دیباچہ کا بھی یہی حال ہے اس میں بھی فارسی کا بے حد تتبع کیا گیا ہے اور معمولی بات کو بڑے بڑے لغات کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے دیباچہ میں جس فرہنگ اصطلاحات کا ذکر کیا ہے وہ کتاب کے ساتھ ملحق نہیں ہے اور اس وقت تک جامع الاخلاق کے جتنے بھی مطبوعہ نسخے دیکھے گئے۔ وہ سب اس فرہنگ سے خالی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود کسی اتفاقی وجہ سے اس کا تکملہ نہ کر سکے ورنہ قرین قیاس نہیں کہ کتاب شائع کرنے والے اس مطبوعہ اضافہ کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور اس گنجینۂ معلومات سے ناظرین کتاب کو محروم رکھیں۔

جامع الاخلاق کے آخر میں ایک مختصر سی مثنوی دی ہوئی ہے اور متن کتاب میں بھی جا بجا ضرورت سے فارسی اشعار کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ نیز ان کا رسالہ صرف اردو تو بالکل منظوم ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی امانت اللہ

شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے مگر ان کی شاعری کا پایہ کچھ بلند نہ تھا اور اس وجہ سے کسی تذکرہ نویس نے ان کو قابل ذکر نہیں سمجھا۔ طبقات شعرائے ہند میں بھی جس میں خصوصیت کے ساتھ انیسویں صدی عیسوی کے اکثر و بیشتر شعراء کا حال لکھا گیا ہے۔ ان کا ذکر نہیں ہے۔ ان کی شاعری بالکل سادہ، علمی، اخلاقی اور پند آموز تھی۔ ان کے اشعار میں شوخی اور زور مطلق نہیں وہ پیشہ ور نغز گو اور سخن طراز نہیں تھے بلکہ تفنن طبع کے طور پر اور کبھی کسی خاص ضرورت پر شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہ تھی اور نہ وہ اس کو اپنا کمال سمجھتے تھے۔ وہ ایک سرکاری درسگاہ کے ذمہ دار مدرس اور عالم تھے اور فی نفسہٖ شاعری سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا ذیل میں ان کی مثنوی اور چند شعری ترجمے معہ اصل کے نقل کیے جاتے ہیں متفرق اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے بلا کد و کاوش اظہار کمال کر دیا ہے اور جہاں گنجائش پائی ہے رنگینی و گل افشانی کی بھی کوشش کی ہے۔

مثنوی

علم حکمت سے جو کہ ہو آگاہ — اور حامل ہو اس کا خاطر خواہ
ہووے تدبیر اس کی محکم تر — رہے آرام سے وہ شام و سحر

ہر دو عالم میں بہرہ ور ہوئے
مالک ملک سیم و زر ہوئے

زندگانی کے خط سے عاطل ہو
علم حکمت سے جو کہ جاہل ہو

یہ نصیحت تو یاد رکھ میری
دوست رکھ جاں سی حکمت عملی

ہے وہ بنیاد بادشاہت کی
اصل مظبوط ہے سیاست کی

یہ سخن ہے پسند ہر دل کو
کب ہے شاہی درست جاہل کو

اپنی اوقات کو تو ضائع نہ کر
روز و شب رہ بہ کسب علم و ہنر

عمل و علم اور درستیٔ رائے
ہیں معاون ترے پئے فضل خدائے

جز ہنر کوئی تیرا یار نہیں
بے ہنر کا کہیں وقار نہیں

خاتمہ اس سخن پر کر شیدا
صلح کل پہ ہے راحت دنیا

متفرق اشعار

ترجمہ

بل بے اے عشق کہن سال! تو ہر دم نو ہے
تیرے فرمان کے تابع ہے ہر اک پیر و جواں
مغرور مت ہو ہرگز مال و جمال سے ہاں
اک ۲ شب میں اس کو لے لیں اور اسکو اک تپ میں
سکنجبیں نے قضارا بڑھایا صفرا کو
عجب ۳ کہ روغن بادام سے ہو خشک دماغ
مرتا ہے کب وہ جو کہ ہوا زندہ عشق سے

اصل

بلہ اے عشق کہن سال! تو ہر روز نوی
زیر فرماں تو ہر جا کہ ضعیف است قوی
بہ مال و جمال خویشتن غرہ مشو
کاں را بہ شبے برند و ایں را بہ تبے
از قضا سرکنگبیں صفرا افزود
روغن بادام خشکی می فزود
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثابت ہے جاودانی ہماری کتاب میں — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خوب دن وہ ہے کہ اس منزل ویراں سے چلوں — خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
ساتھ جاناں کے چلوں راحتِ جانی پاؤں — راحتِ جاں طلبم وز پے جاناں بروم
ذرّہ سا رقص کناں راہ طلبگاری میں — بہ ہوائے رخِ او ذرّہ صفت رقص کناں
پہنچوں مطلب کو گر اس چشمۂ خور تک پہنچوں — تالبِ چشمۂ خورشید درخشاں بروم

اے دوست اگر گزرے عدو کے جنازہ پر — اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری
شاداں نہ ہو کہ تجھ پہ بھی گذرے یہ ماجرا — شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود

غبار تن کا مرے ہے حجاب چہرۂ جاں — حجاب چہرۂ جاں می شود غبار تنم
خدا کرے کہ میں اس چہرہ سے نقاب اٹھاؤں — خوشا دمے کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم
نہ یہ قفس ہے سزاوار مجھ خوش الحال کے — چنیں قفس نہ سزائے من خوش الحان است
عدم کا طائر قدسی ہوں اس چمن میں جاؤں — روم بہ گلشنِ رضواں کہ مرغ آں چمنم

۱۰ ع۔ اس سے بہتر اور کیا ارشاد ہے — ع۔ ازیں خوشتر چہ باشد حسن ارشاد

جامع الاخلاق کا ایک ایڈیشن ۱۸۴۹ء میں منشی غلام حیدر نے مطبع احمدی کلکتہ سے شائع کیا تھا یہ سب سے قدیم ایڈیشن ہے اور آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ایک ایک نسخہ ہے اور معارف جلد ۱۱ نمبر ۳ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب ساکن عظیم آباد کے ہاں بھی ایک نسخہ اس سنہ کا طبع شدہ ہے یہ نسخہ ٹائپ کے حروف میں ہے اور اس کی ایک کاپی اس وقت

ہمارے پیش نظر ہے۔ ذیل میں اس سے ایک چھوٹا سا اور کسی قدر سلیس بیان نقل کیا جاتا ہے اس سے مولوی امانت اللہ کے طرز بیان کی خصوصیات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

تنویر۔ حکیم ارسطاطالیس نے کہا ہے عدالت فضیلت کے جزو کے برابر ہے بلکہ وہ تمام فضیلت ہے اور ظلم جو مقابل اس کے ہے رذیلت کے جز کے مطابق ہے بلکہ وہ سرتاپا رذیلت ہے لیکن عدالت پہلے شخص اور اس کے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے جیسے اس کی طرف اشارہ ہوا پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے وہ قیامت میں پوچھا جائیگا۔ ان کے احوال سے اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کے مثال ہیں صحابیوں نے پوچھا وے کون آدمی ہیں فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں۔ پھر ان کے حق میں جو ان کے ملک اور ان کے تابع فرمان ہیں حکیموں نے بطور تمثیل کے کہا ہے جو چراغ کہ اپنے پاس ہے۔ اگر اسکو روشن نہیں رکھ سکتا ہے پس جو کہ اس سے تفاوت ہے بطریق اولے اس کو روشن نہیں رکھے گا یعنی جو کوئی اپنے

اور اپنے خصائل اور اعضا کی عدالت سے عاجز رہے
پھر اس سے اہل خانہ اور شہریوں کی عدالت متصور نہیں ہے
چاہیے کہ اپنے تن بدن کی عدالت سے خبردار ہو اور افراط
تفریط کی مضرت سے احتراز کرے بعد اس کے گھر کے
لوگوں یا شہر کے رہنے والوں سے وہی طریق مسلوک رکھے
اور نائب خداوند تعالیٰ کا کہلاوے۔ حکیموں نے کہا ہے
کہ جب خلق اللہ کے بند وبست کی ڈوری ایسے بزرگ
کے قبضۂ اقتدار میں رہے تو زمانہ کا انتظام سررشتہ بخوبی
مستحکم ہو اور اس کے مبارک ڈور کی تاثیر سے کنبے
اور نسل میں برکت پیدا ہو روایت ہے کہ کسریٰ کے خزانہ
میں ایک تھیلا پایا اس میں گیہوں کے دانے ازبسکہ
بڑے بڑے چھوہارے کی مثال تھے اس تھیلے پر
لکھا ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہوں کی عدالت بنہایت
کامل تھی برکت اس مرتبہ پر تھی۔ درست ہے کہ اس
زمانۂ واضح برہان میں حضرت خاقان صاحب زمان کی
عطوفت و رحمت کی برکت سے تھوڑی مدت کے بیچ
ہر طرح کی جمعیت و خاطر جمعی اہل بلاد اور کافہ عباد کو پہنچی
اور ملکوں کا میدان جو ظالموں کے ظلم سے پایمال بلا و محنت
ہو گیا تھا آبادی پر آیا یہ نشانی نزول رحمت اور علامت برکت

حصولِ برکت کی ہے۔ بیت

خدایا تو ملک اس سے آباد رکھ　　دلِ خلق کو خرم و شاد رکھ"

مولوی امانت اللہ نے اخلاق جلالی کا ترجمہ کرتے وقت اصل کتاب میں سے محقق دوانی کا دیباچہ اور دعائے حضرت خاقان اور ذکر القاب ہمایون بادشاہ ظل اللہ اسلام پناہ کا ترجمہ نظر انداز کر دیا اور اس کی جگہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند" اور کپتان جیمس مونٹ مدرس تفریق ہندی مدرسۂ عالیہ" کی مدح سے بھر دی مگر متن میں جہاں ضمناً حضرت خاقان کی مدح آئی ہے اس کو خارج کرنا بھول گئے۔ اور جوں کا توں ترجمہ کر ڈالا چنانچہ ہم نے اوپر جو بیان نقل کیا ہے اس میں بھی ایسا ایک ٹکڑا آ گیا ہے جو ان کی نظر سے بچ گیا اور اردو ترجمہ بھی بحال رہا۔ ساری کتاب میں جہاں جہاں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور عربی امثال تھے ان کو بھی اردو میں ترجمہ کر کے لکھا ہے اور اصل عربی عبارت نہیں لکھی البتہ ادعیۂ ماثورہ کو بتمامہ عربی میں رہنے دیا۔ اصل فارسی کا خاتمۃ الکتاب بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مولوی امانت اللہ نے خود کو مترجم تفریق ہندی اور کپتان جیمس مونٹ کو مدرس تفریق ہندی بتایا ہے تفریق سے ان کی مراد سکشن یا شعبہ ہے اور چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر اردو کو ہندی اور ہندوستانی کہتے تھے اس لیے اس سے ان کی مراد صرف اردو ہی ہے۔

صرف اُردو مولوی امانت اللہ کی دوسری تصنیف صرف اُردو منظوم ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ اُردو کی مختصر سی نظمیہ گرامر ہے صرف و نحو کے مسایل نثر میں پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے اور پھر بھی طلبا کو یاد نہیں ہوتے اس لیے مولوی امانت اللہ نے صرف کے ابتدائی مسائل کو نظم کر دیا تاکہ طلبا اس کو آسانی سے حفظ کر سکیں۔ اور جب کبھی کسی مسئلہ کی طرف رجوع کرنا پڑے فوراً حافظہ پر بار ڈال کر وہ اشعار دہرالیں۔ یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ اس کے نسخے نایاب ہیں۔ حسن اتفاق سے کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں اس کا ایک قلمی نسخہ نظر پڑا۔ اس کی کتابت شوال ۱۲۳۴ھ کی ہے اور سکندر آباد عرف حسین ساگر میں لکھا گیا ہے یہ (۱۵۵) صفحات پر مشتمل اور خوشنما خط میں ہے یہ نسخہ بہت ہی قدیم ہے اور تاریخ تصنیف یعنی ۱۲۲۱ھ کے صرف تیرہ سال بعد لکھا گیا ہے۔ حمد و نعت کے بعد "بیان میں سبب نظم اس رسالہ کے" کے عنوان سے یہ اشعار دیے گئے ہیں پھر صرف اُردو کے ایک ایک مسئلہ کو اجمالی طور پر مثالوں وغیرہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

گر نہ انسان کی زباں گویا ہوتی فرق حیواں سے کب ہوتا

سو یہ ہو قاعدے پہ گر جاری ہو مشابہ بصورتِ جانوری
اس لیے ہر زباں کے دانشور رکھتے اس کی بنا ہیں قانوں پر
قاعدے ہر زباں کے ہیں دو دو صرف اور نحو کہتے ہیں جن کو
ہیں یہ دونوں اصول قانوں کے اور فروع ان کے ماورا جتنے
صرف ان دونوں میں سو اقدم ہے لفظ کا معنے جس سے محکم ہے
گر نہ اس قاعدہ کا تو احوط ہو وے پس گفتگو نثری غلط
اپنے رتبے میں گو ہر ایک زباں حسن تہذیب سے رکھے ہے شاں
ان میں سو ہر زبان اردو کی ہے لطافت میں معدنِ خوبی
کی نظر میں نے جو تامل سے مشتمل قاعدہ پہ پایا اسے
تب سے خاطر میں میری تھا خلجان طالبوں کو بتاؤں اسکا نشان
جب لکھی صرف اسمیں اکثر وکماثبت نحو سے اس کی میں ہوا ساکت
دوستوں نے مجھے یہ دی تکلیف صرف کو نظم میں کروں موزوں
گرچہ لایق نہیں میں اسکے ہوں گو ہر نظم کو کروں موزوں
نظم قانون کی علے التخصیص امر دشوار نہ ہے بالتخفیص
پر مجھے التماس یاروں کا آستین کھینچ اس طرف لایا
الغرض اب خدا کے فضل اوپر کر توکل میں اس پہ باندھ کمر
کہ وہی فاتح ہدایت ہے اور وہی خاتم نہایت ہے
یہ رسالہ ہوا فضل حق سے تمام صرفِ اردو رکھا میں اسکا نام

سن تھے بارہ سے بست و یک ۱۲۲۱ھ کہ یہ کانِ گہر ہوئی تیار ع

مولوی سید مقبول احمد "جامع الاخلاق پر نظرِ ثانی" کے عنوان سے مضمون لکھتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں "نعت شریف کے انداز نگارش سے پایا جاتا ہے کہ مذہب شیعہ امامیہ رکھتے تھے لیکن کمال خوبی و قابلیت یہ ہے کہ ترجمہ میں معتقدات کا اظہار کسی پیرایہ میں نہیں ہونے پایا۔ اکابر دین و سلف کرام کے نام نامی اور ذکر گرامی اسی شان ادب اور پرواز عظمت سے لکھتے ہیں جیسے علامہ محقق کے قلم سے نکلے تھے۔" ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب مترجم نے اپنے معتقدات کو کسی طور پر بھی ظاہر ہونے نہیں دیا بلکہ مصنف نے جس طرح بزرگانِ دین و سلف کرام کا ذکر کیا تھا اسی طرح بیان کیا ہے تو پھر اس کے مذہبی عقاید کے متعلق کیسے رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ رہا نعت شریف کا انداز نگارش ہم اس میں کبھی کوئی بات ایسی نہیں پاتے جس سے ان کے خاص معتقدات کا سراغ ملتا ہو۔ ذیل میں ہم نعت رسول صلعم کی اصل عبارت نقل کیے دیتے ہیں۔ ناظرین خود اس سے اندازہ لگالیں کہ... اس عبارت سے ان کے معتقدات پر کس قسم کی روشنی پڑتی ہے اور پھر ان کو خواہ شیعہ امامیہ سمجھیں یا ماوراء النہر کا سنی۔ ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سچے مسلمان اور بلند پایہ عالم تھے۔

ع نظم کی چستی درستی کے علاوہ ممکن ہے کہ بعض معانی بھی قابل تامل ہوں! ۱۲

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہزار ہزار شکر اس کارساز حقیقی کا ہے جس نے اس عالم کون و فساد کے بند و بست جزوی کو تدابیر منزل سے محکم اور ممالک ایجاد کے قوانین کلی کو سیاست مدن سے منتظم کیا اور بہت آرزو خالق بے نیاز سے ہے کہ اس نے اپنے خواص مخلوقات کو زیور تہذیب الاخلاق سے مہذب اور عوام موجودات کے تئیں ان کی تبعیت سے مادب کیا۔ پس ہمیں لازم ہے کہ مقابل اس نعمت عظمیٰ کے سجدے شکر کے بجالا دیں اور ہمیشہ اپنی اوقات کو درستی اخلاق میں مصروف رکھیں تاکہ ظلماتِ صفاتِ رذیلہ سے نجات پاکر حسنِ اعمال کی صراط مستقیم پر جو موجب وصول مکان مقصود کا ہے آ دیں لیکن پہچان اس راہ کی بے ہدایت انبیا و رسل کے نہیں ہو سکتی۔ پھر اس میں چلنا بغیر روشنی شمع نبوت کے ممکن نہیں۔ علی الخصوص تجلی انوار سے مشکوٰہ ایوان رسالت کے اور پرتو نورانی سے چراغ خاندانِ نبوت کے، ہدایت کرنے والے راہ اسلام کے، بتانے والے معنی کنت کنزاً مخفیاً کے، مضمون مخلقت خلقہا کے، باعث ایجاد عالم ہو جب افتخار بنی آدم، خاتم الانبیاء شافع الوریٰ نبی اور رسول

ہمارے محمد مصطفےٰ ۔

بیت ہا ۔

جو اس راہ سے بھٹکے پھر وہ کبھی   نہ پہنچیگا منزل کو اے متقی
بحقِ رسول و بنی فاطمہ   خدا میرا ایماں پہ کر خاتمہ

مظہر علی خان ولاؔ

بہادر علی حسینی کی طرح ولاؔ بھی مشہور ہیں مگر عام طور پر ان کے حالاتِ زندگی اور مؤلفات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے مؤلفات میں سے صرف ایک دو کو طباعت واشاعت کا موقع ملا۔ باقی نہ معلوم کن اسباب و وجوہات کی بنا پر قلمی نسخوں کی حد تک محدود رہیں۔ متداول تذکرے اور خود ان کی تصانیف بھی ان کے حالات سے خالی ہیں چند غیر معروف تذکروں میں بعض کارآمد باتیں دستیاب ہو گئیں اور اس طرح متفرق طور پر جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ بیان کیے جاتے ہیں۔

ان کا اصلی نام جیسا کہ غلام ہمدانی مصحفی اور بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے، مرزا لطف علی تھا مگر وہ مظہر علی خاں کے عرفِ عام سے مشہور ہیں اور اپنی تالیفات میں بھی انھوں نے اپنا یہی نام لکھا ہے ان کے والد سلیمان علی خاں وداؔد عرف میرزا محمد رماں فارسی کے مشہور شاعر تھے اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مفتخر اور شرفائے دہلی میں شمار ہوتے تھے مظہر علی خاں کا مولد وطن دہلی ہے ان کی نشو و نما اور

تربیت بھی دہلی ہی میں ہوئی۔ ان کے تخلص کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ خود ان کے اور بعض معاصرین کے بیان سے ولاؔ تخلص ثابت ہوتا ہے مگر مصحفیؔ باطنؔ اور مصطفےٰ خاں شیفتہؔ نے والاؔ لکھا ہے۔

ولاؔ بقول شیفتہؔ ممنون کے شاگرد تھے ممنونؔ شاہ جہاں آباد کے قریب سونی پت کے رہنے والے تھے ان کے والد قمرالدین منتؔ بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ممنونؔ نے تحصیل علم اپنے والد ہی سے کی اور ایک زمانہ لکھنؤ میں بسر کیا نیز ایک عرصۂ دراز تک دارالخلافہ دہلی میں بادشاہ کے دربار میں بزمرۂ شعرا ملازم اور فخر الشعرا کے خطاب سے سرفراز رہے تذکرہ گلشن بےخار کی تالیف یعنی ۱۲۵۰ھ میں بقید حیات اور اجمیر شریف کے کوہستان میں مقیم تھے۔ شیفتہؔ نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے ولاؔ نے ممنونؔ کے سوا مرزا جان طپشؔ اور غلام ہمدانی مصحفیؔ سے بھی مشورہ سخن کیا ہے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی تھی اور اس پر عالمانہ عبور رکھتے تھے علاوہ ازیں ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔

ولاؔ صاحب دیوان ہیں اور ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا اس کے علاوہ کسی اور کتب خانہ میں ان کے دیوان کا پتہ نہیں چلا۔ شیفتہ

اور جہاں کے تذکروں میں یہ دو شعر ملے۔

یوسف کا نقشہ در و دیوار پہ کھینچا — کیوں تو نے زلیخا نہ دل زار پہ کھینچا
ہمدام فقط نہ تجھ کو ہی اس گل نے غش کیا — آیا جو انجمن میں تو بس گل نے غش کیا

فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے ساتھ ہی وہ بھی اس میں ملازم ہو گئے۔ اور فارسی ہندی کتابوں کا ترجمہ کرنے لگے۔ ان کا نہ تو سنہ ولادت معلوم ہے اور نہ سنہ وفات کا کچھ پتہ چل سکا۔ البتہ بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکرہ "دیوان جہاں" میں جو سنہ ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ء میں تالیف ہوا ہے۔ ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا مظہر علی ولاؔ کی مؤلفات میں بہ لحاظ تاریخ سب سے پہلے "مادھونل اور کام کندلا" کا ذکر کیا جانا چاہیے یہ ان کی پہلی تالیف ہے اور اوائل سنہ ۱۸۰۲ء میں مرتب ہوئی۔ دراصل یہ ایک ہندی زبان کا عاشقانہ قصہ ہے۔ جو موتی رام کبیسور نے تصنیف کیا تھا اس میں ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کام کندلا کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی اس کا صرف ایک حصہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی "بیاض ہندی" میں چھپا ہے اور ایک قلمی نسخہ کتب خانہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے خاتمۃ الکتاب میں مترجم نے دو تاریخی

قطعے لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵ھ۔ اور دوسرے سے عیسوی سنہ ۱۸۰۲ء نکلتا ہے ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور نے برٹش میوزیم کے نسخہ سے اسکا حسب ذیل اقتباس نقل فرمادیا ہے۔

"بلند بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا نئے نئے طور کے مکان منقش عالیشانوں پر سنہری کلسوں کے چمکنے سے عجیب اجالا۔ صاحب علم و ہنر، افعال دنیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے، وہ پہ، پاوتی نگری مشہور تھی اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم وحیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب وہ مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد اور دشمن اس کے قہر سے برباد، جابجا اس کی دھاک، غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا اور اس کے محل میں عورتیں ہر ایک ذات کی تھیں لیکن سب سے بہتر اور برتر پاکیزہ طینت و آراستہ بزیب و زینت، شرم و ادب سے اور علم و ہنر سے مالا مال، اور خوبیوں سے اس کی ساری خلقت خوشحال، سامان عیش و نشاط بلکہ سراپا انبساط، شکل و شمایل پری، سراپا غرور سے بھری، عیش و نشاط کے طور سے آگاہ

شکل میں مانند ماہ گلبدن چمن شادمانی، گل گلزار جوانی، ابرو کمان، تیر اس کی ہر اک مژگان، ناز و عشوے کے اس میں تمام آیئن، پنڈت حسین و نازنین، اس کی رانی تھی، اور ایک مادھو نام برہمن خوب صورت و خوش سیرت اس کا بڑ مصاحب تھا (قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق نمبر ۱۳)

ترجمہ کریما ولاؔ نے حضرت شیخ سعدی شیرازی رح (ذکر ۱۱۸۴ء.... ۱۲۹۱ء) کے مشہور پند نامہ "کریما" کا بھی اُردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ پند نامہ سعدیؒ فارسی کا بے حد مشہور و معروف منظوم رسالہ ہے اور اُردو میں اب تک اس کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہماری نظر سے بھی کئی اور اُردو ترجمے گزر چکے ہیں۔ ولاؔ نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۲ء اوائل میں کیا ہے۔ خاتمہ پر حسب ذیل قطعہ تاریخ درج ہے۔

کریما کا جب ترجمہ کر چکا	تو مجھ سے مری طبع نے یہ کہا
کہ تاریخ کہہ یادگارانہ طور	سن عیسوی کے موافق بغور
اسی فکر میں تھا کہ آئی ندا	ہوا ترجمہ نظم میں یہ ولاؔ

پہلی مرتبہ ملا اکبر گل کرسٹ نے باغ اُردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء کے ساتھ بطور ضمیمہ شایع کیا تھا اس کے بعد اتالیق ہندی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء کے ساتھ بھی شایع ہوا۔ ہمارے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے ولاؔ نے نہایت صاف اور بامزہ

ترجمہ کیا ہے اور اکثر و بیشتر اشعار میں اصل فارسی کی خوبی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ذیل میں چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ترجمہ کی خوبی بعض صورتوں میں بے حد قابلِ داد ہے۔

مرے حال پر کر تو بخشش خدا — کہ ہوں میں گرفتارِ حرص و ہوا
نہیں ہے ہمیں داورس تجھ سوا — تو ہی بخش دے عاصیو گناہ
گنہ سے مجھے باز رکھ اے خدا — گنہ بخش اور راہ نیکی دکھا
زباں کو دہن بیچ جب تک ہے جا — ہے مقبول دل کو نبی کی ثنا
ہے نبیوں سے بہتر حبیب الٰہ — کہ عرش بزرگ اس کا ہے تکیہ گاہ
وہ ہے شہسوار براق ایسا جو — کہ اک پل میں آیا فلک پر سے ہو
تری عمر کے گزرے چالیس سال — نہ طفلی کا ابتک گیا وہ خیال
ہوا و ہوس میں گزاری سدا — نہ تو نیک کاموں میں اک دم رہا
بھروسا نہ کچھ عمر فانی پہ کر — زمانے کی بازی سے مت ہو نڈر

(ترجمہ پند نامہ سعدی قلمی صفحہ ۱۳۰)

ہفت گلشن ولا کا تیسرا کارنامہ ہفت گلشن ہے یہ کتاب فارسی زبان میں ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے لکھی تھی ولا اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ۱۲۱۶ھ کے اواخر میں اس کا ترجمہ کیا ہے اس کتاب کا موضوع تہذیب الاخلاق ہے اور چونکہ ساری کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب گلشن کے

نام سے موسوم ہے۔ اس لیے اس کا نام ہفت گلشن رکھا گیا اس میں مشرق کی دیگر اخلاقی کتابوں کی طرح معاشرت، گفتگو کے آداب اور احکام اور بالادستوں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دی ہے۔ مضامین کی مناسبت سے اخلاقی قصّے اور حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں احادیث نبوی صلعم اور حضرت علیؓ کے زرین امثال و اقوال سے کتاب کے مضامین کو زیادہ قابل قبول بنایا گیا ہے یہ کتاب کبھی طبع نہیں ہوئی ہے اور اس وقت تک صرف ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلا ہے اور وہ برٹش میوزیم میں ہے ممکن ہے کہ یہی مولف کا مسودہ ہو۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس جو ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی عنایت سے برٹش میوزیم کے نسخے سے نقل کر کے بھیجا ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔

حکایت چوتھی، مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی۔ یہ تمام احوال طاؤس نے اس درخت کے اوپر سے دیکھ کر کہا اے مرغی یہ کیا خیال فاسد تیرے دل میں آیا ہے مگر انڈے سانپ کے نہیں پہچانتی ہیں تو نے بہتر یہ ہے کہ اس بلا سے دست بردار

ہو والا جس وقت کے بچے انڈوں میں سے نکلیں گے تو تجھے
مار ڈالیں گے اس بے ہوش نے اس کی بات کو نہ سنا اور اپنے
کام میں بدستور مشغول رہی لیکن بعد گزرنے چالیس روز کے بچے
انڈوں میں سے مانند خراطین کے ایک بارگی جو نکلے تو سارے
بدن میں اس کے چمٹ گئے یہاں تلک کہ کام اس کا تمام کیا۔
فائدہ اس قصہ سے یہ ہے کہ جو کوئی نصیحت یار صادق کی۔
اور دوست مشفق کی نہ سنے آخر کار وہ پشیمانی کھینچتا ہے اور
اسی طرح سے ہلاک ہوتا ہے

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق ۵)

اتالیق ہندی ڈاکٹر گل کرسٹ ہی کی نگرانی میں ولا نے ایک
کتاب "اتالیق ہندی" مرتب کی تھی۔ اس میں
فارسی پڑھنے والوں کے مطالعہ کی سہولت کے لیے اخلاقی اسباق
وحکایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شایع
ہوئی تھی اور اس کی تالیف میں کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی ان
کی مدد کی ہے۔

بیتال پچیسی ولا کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ "بیتال پچیسی"
ہے یہ کتاب ابتداءً سنسکرت زبان میں لکھی گئی
ہے، بارہویں صدی ہجری میں بہ عہد محمد شاہ، سورت کبیشور نے
برج بھاشا میں اس کا ترجمہ کیا ہے اس برج بھاشا کے نسخہ سے ولا

نے ۱۸۰۲ء م ۱۲۱۷ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں اور چونکہ ان کہانیوں کا راوی ایک شخص بیتال نامی ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام "بیتال پچیسی" رکھا گیا۔ بیتال ایک مردہ ہے جو قوم کا تیلی تھا اس کو کسی جوگی نے مسان (یعنی قتل کر کے درخت سے لٹکا کر بھوت) بنا رکھا تھا اس نے بھوت بن کر یہ کہانیاں بیان کی ہیں اس کے ترجمے میں سری للولال کوی نے ولاؔ کو بہت کچھ مدد دی ہے۔ للولال بھی فورٹ ولیم کالج میں ہندی و سنسکرت کے مترجم تھے ان کا حال آگے بیان کیا جائیگا۔

"بیتال پچیسی" پہلے کلکتہ سے شایع ہوئی اور ایک عرصہ تک مقبول خاص و عام رہی۔ اس کے متعدد ایڈیشن ہندوستانی مطابع سے نکل چکے ہیں اور اب تک قدیم قصوں کی کتابیں فروخت کرنیوالوں کے پاس اس کے نسخے نظر آتے ہیں۔ آج کل قدیم قصوں کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹتی جاتی ہے اور ان کی جگہ ناول اور مختصر افسانوں نے لے لی ہے اول تو ان قدیم قصوں میں فوق العادت بلکہ بعض مرتبہ فوق الفطرت باتوں کا طومار لگا رہتا ہے۔ اور پھر ان کی زبان اور طرز بیان بھی فرسودگی پیدا ہو گئی ہے اور فسانہ نویسی نے بھی ترقی کے اتنے مدارج طے کر لیے ہیں کہ اب ان قدیم قصوں کی پہلی سی دل کشی کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ پھر بھی اس زمانہ کی چند مخصوص کتابیں ایسی ہیں کہ ایک سو سال سے زیادہ

مدت گزر جانے اور زبان وطرز بیان میں زبردست انقلابات رونما ہوچکے باوجود ان کی بہار تازہ ہے اور اب بھی انہیں اسی شوق اور لطف سے پڑھا جاتا ہے ان میں سے ایک تو "باغ و بہار" ہے اس کی زبان اور طرز بیان میں ایسی دلکشی ہے کہ اردو زبان کا شیدا چٹخارے لے کر پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر چند متروک الفاظ اور ترکیبوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور بعض خلاف عقل و عادت باتوں سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اس کی زبان اب بھی ٹھیٹ روزمرہ کا بہترین نمونہ اور اس کا مواد دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔

"بیتال پچیسی" میں ہندی الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ گویا اصل بھاشا کی کتاب کو دیوناگری رسم الخط سے اردو رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ بعض الفاظ بہت بعید از فہم اور اردو زبان میں داخل ہونے کے لایق ہی نہیں معلوم ہوتے اس میں کوئی شک نہیں کہ ولّا نے اس کی زبان کو سلیس اور بامحاورہ رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہندی الفاظ کی موقع بے موقع بھرمار نے سلاست وصفائی کو بگاڑ دیا ہے۔ ایک حکایت کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے مذکورۂ بالا بیان کی تصدیق ہو جائیگی۔

ایک راجہ پرتاپ مکٹ نام بنارس کا تھا اور اس کے بیٹے کا نام

بجرمکٹ جس کی ناری کا نام مہادیوی ایک دن کنور اپنے دیوان

مے بیٹے کو ساتھ لیکر شکار کو گیا اور بہت دور جنگل میں جانکلا اور اس کے بیچ ایک مندر نایاب دیکھا کہ اس کے کنارے ہنس، چکوی چکوا، بگلے، مرغابیاں سب کے سب کلول میں تھے۔ چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے۔ کنول تالاب میں پھولے ہوئے کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جن کی گھنی گھنی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوا آتی تھی اور پنچھی پکھیرو درختوں پر جھنڈوں میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن پھول رہے تھے۔ ان پر بھونروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچ اور منہ ہاتھ دھو کر اوپر آئے وہاں ایک مہادیو کا مندر تھا گھوڑوں کو باندھ، مندر کے اندر جا، مہادیو کا درشن کر باہر نکلے جتنی دیر ان کو درشن میں لگی تھی اس عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لیے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلنے لگی۔ ادھر دیوان کا بیٹا بیٹھا اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔ دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے۔ اور راج پتری نے اس

کنور کو دیکھ سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی
پھول ہاتھ میں لے کان سے لگا دانت سے کتر پاؤں تلے دبا
پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا اور سہیلیوں کو ساتھ لے سوار ہو
اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو بروہ میں
ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے
آگے حقیقت کہنے لگا۔''

تاریخ شیر شاہی

ولا کا ایک اور یادگار کارنامہ "تاریخ شیر شاہی" ہے۔ یہ شیر شاہ سوری افغانی بادشاہ دہلی سنہ ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء کے عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کے حکم سے عباس خاں بن شیخ علی شروانی نے فارسی میں لکھی تھی کپتان جیمس موئٹ کے ایما سے ولا نے سنہ ۱۲۳۰ھ میں اس کا اردو ترجمہ کیا۔ خاتمۃ الکتاب میں ختم شدہ اردو ترجمہ تاریخ شیر شاہی بہ تاریخ دی الاول سنہ ۱۲۳۰ھ م ۲ر اگست درج ہے۔ گارساں دی تاسی .... نے اس کو فرانسیسی میں ترجمہ کر کے پیرس سے سنہ ۱۸۶۵ء میں شائع کیا تھا۔ اصل اردو ترجمہ ابتک شائع نہیں ہوا۔ کتب خانہ محکمہ ہند (لندن) میں ایک قلمی نسخہ غالباً اصل مسودہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس کی نقل بھیجی ہے معلوم ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ ہے اقتباس ملاحظہ ہو۔

اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تا وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا اس سے یہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاڈ ملکہ اور رستم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کرونگا اور مہمان داری کی رسم بخوبی بجالایا۔ کوئی فروگذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا اور کہا کہ اگر لاڈ ملکہ میرے تین قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہونگا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے میرداد نے کہا کہ خزانہ اور قلعہ سوائے بادشاہ کے دنیا مناسب نہیں ہے لیکن جو بندہ آپ کی ملازمت میں آیا اور تم نے بہت اشتیاق آرزو و تمنا اظہار کی اور میرا بھی اعزاز و اکرام بہت سا کیا اور مہمانداری کا حق جتنا چاہئے بجالائے۔ میرے دل میں بدلہ اس کا سوائے اس کے کوئی نہیں آتا کہ یہ قلعہ تمہارے ہاتھ آوے اور میں بہ مقدور اپنے تئیں اس کی سعی میں قصور نہ کرونگا۔

(تاریخ شیر شاہی قلمی ۱۴۵)

جہانگیر نامہ

گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ ولاؔ نے تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ جہانگیر نامہ کے نام سے کیا ہے اس میں جہانگیر کی تخت نشینی سے چھٹے سال جلوس یعنی ۱۶۱۰ء تک کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں اس کا ذکر کسی اور ذریعہ سے دریافت نہ ہو سکا اور ہم ٹھیک طور پر اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتے۔

ولاؔ کی تالیفات میں بہ لحاظ زبان و طرز بیان بے حد فرق ہے ہر کتاب اپنی اصل پر مبنی ہے۔ کسی میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے تو کسی میں فارسی طریقہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے دیگر ارباب قلم کے مقابلہ میں ولاؔ کی زبان زیادہ پرانی نظر آتی ہے اس میں بعض قدیم ترکیبیں دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

مرزا جان طپش

طپش کا نام اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ منشیوں اور اہل قلم میں شامل نہیں ہے مگر وہ بھی ایک زمانہ میں فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے اور دوسرے مترجمین کی کتابوں کی نظر ثانی اور اساتذہ قدیم کے کلام کے انتخاب اور دیگر تالیفی کام ان کے سپرد تھے اس کے علاوہ وہ شاعر کی حیثیت سے وہ کلکتہ میں بہت ممتاز تھے اور کالج نے ان کا کلیات خرید کر شائع بھی کیا تھا اس لحاظ سے وہ بھی اس کالج کے ارباب قلم میں شامل اور مستحق توجہ ہیں۔ طپش کے شاعر ہونے کی وجہ سے اردو کے اکثر تذکروں میں ان کے حالات ملتے ہیں ان کا اصلی نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے مگر وہ مرزا جان کے عرف سے بہت مشہور تھے ان کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلہ نسب بخارا کے مشہور بزرگ اور صوفی سید جلال الدین المعروف بہ جلال بخاری تک پہنچتا ہے ان کے والد مرزا یوسف بیگ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے والد کب اور کس کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے۔ البتہ یہ محقق ہے کہ طپش دہلی میں پیدا ہوئے۔ صرف ڈاکٹر فیلن کا قول ہے کہ طپش کی ولادت

سنہ ۱۱۸۲ھ میں ہوئی۔ طپش نے دہلی ہی میں نشو و نما پائی اور ان کے بچپن اور جوانی کا بہت بڑا حصہ علمائے دہلی کی صحبت میں گزرا اور علم و ادب کے باکمالوں کے ہاتھوں تربیت پائی۔ طپش نے عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت زبان بھی سیکھی اور اس میں خاص مہارت بہم پہنچائی تھی۔ طبقات الشعرائے ہند کے مولف منشی کریم الدین کا بیان ہے کہ طپش کو فن بلاغت میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی اور اس کی تحصیل مرزا احمد یار بیگ سائل سے کی تھی اور دہلی میں پیدا ہونے اور وہیں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے اہل دہلی کے مخصوص محاورں اور روزمرہ سے بخوبی واقف تھے طپش ابتداً شاہ عالم بہادر کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے دربار میں ملازم ہوئے وہ موروثی سپاہی پیشہ تھے اور جہاندار شاہ کے ہاں بھی فوجی خدمت ہی پر مامور تھے۔

منشی کریم الدین ہی کا بیان ہے کہ طپش کو شعر گوئی کا شوق سنہ ۱۱۹۸ھ میں ہوا پہلے مرزا احمد یار بیگ سائل کے جن سے عروض و بلاغت سیکھی تھی شاگرد ہوئے اور پھر چند روز بعد حضرت خواجہ میر درد کو کلام دکھانے لگے۔ مرزا احمد یار بیگ دہلوی اور قوم اوزبک سے تھے۔ ان کو شاہ عالم اور سودا سے تلمذ حاصل تھا۔ سائل بہت گمنام شاعر ہیں ان کے نہ تو

حالات ہی ملتے ہیں اور نہ کلام شائع ہوا ہے۔ صرف تذکرہ سخن شعرا مولفہ عبدالغفور خاں نساخ میں تین شعر نظر پڑے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے شاعر تھے اور پر کیف اشعار کہتے تھے طپش کا تخلص مصطفٰے خاں شیفتہ مولف گلشن بے خار اور قطب الدین خاں باطن مولف گلستان بیخزاں نے تائے فوقانی سے لکھا ہے مگر نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں۔

مرزا جان طپش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلوں میں تخلص ان کا طائے حطی سے لکھا تھا اس لیے میں نے تاد فوقانی سے نہیں لکھا۔"

طپش ۱۱۹۸ھ کے اواخر میں مرزا جہاندار شاہ کی معیت میں لکھنؤ آئے یہی زمانہ جیسا کہ مولف طبقات الشعرائے ہند کے بیان سے ظاہر ہے ان کی شاعری کے آغاز کا ہے۔ شہزادہ کے دربار میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ اور شعرائے عہد و اساتذۂ وقت اپنے افکار طبع سے مجلس گرم رکھتے تھے۔ طپش کا شوق شعر گوئی بڑھنے لگی۔ اور ہر وقت کی شاعرانہ صحبتوں نے شاعری کے نکات و محاسن اور معائب کے پرکھنے کی اچھی خاصی صلاحیت پیدا کر دی پھر اس پر طبیعت کا فطری میلان اور علمی قابلیت سونے پر سہاگہ تھی۔ شہزادہ جہاندار شاہ دن تک نواب آصف

الدولہ کے ہاں رہ کر بنارس گئے ان کے ہمراہ طپش بھی روانہ ہوئے اور غالباً ان کے انتقال ۱۲۰۱ھ تک وہیں رہے ان دنوں بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں مؤلف گلزار ابراہیم ناظم فوجداری تھے۔ وہ بھی بڑے سخن سنج اور بلند پایہ شاعر تھے وہاں بھی شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا۔

مرزا جہاندار شاہ کے انتقال کے بعد وہ تمام صحبتیں درہم برہم ہوگئیں اور طپش نے بھی بنارس سے نکل کر تلاش معاش میں بنگال کا سفر کیا اور ڈھاکہ میں نواب سید احمد علی خاں شمس الدولہ کے مصاحب مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں نواب مذکور کے ایما سے اپنی کتاب "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کلکتہ میں کب آئے غالباً فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے قریبی زمانہ میں کلکتہ آچکے تھے یہاں انہوں نے کالج کی طرف سے جو کتابیں ترجمہ ہوتی تھیں ان کی نظر ثانی کا کام شروع کیا۔ مگر خود کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا البتہ انہوں نے ایک فارسی زبان کے قصہ کو بہار دانش کے نام سے لکھا ہے مگر یہ بھی منظوم ہے۔ ۱۸۱۱ء میں ان کا کلیات بھی کالج کی طرف سے شایع ہوا ۱۸۱۲ء تک کلکتہ میں مقیم تھے اور غالباً اس کے بعد کلکتہ ہی میں وفات پائی ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا ہے کہ ۱۲۲۹ھ م ۱۸۱۴ء سے قبل فوت ہوئے۔

کلیات طپش کے کلام کی تعریف میں تقریباً تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں۔ مولف طبقات شعرائے ہند لکھتے ہیں "اس کے شعر بہ سبب صفائی اور فصاحت اور تازہ مضمون ہونے کے مشہور ہیں۔" خمخانۂ جاوید کے مولف کی رائے ہے "شعر سے دلی عشق تھا۔" چنانچہ زبان میں صفائی فصاحت اور مضمون کی تازگی کلام کا لطف بڑھاتی ہے" اسی طرح نساخ شیفتہ اور باطن نے بھی تعریف کی ہے۔ طپش ایک کہنہ مشق شاعر اور شاعری کے رموز و نکات سے آگاہ تھے۔ اور اپنے ہمعصر شعرا کی طرح صفائی زبان کو اپنا جوہر سمجھتے تھے۔ کلکتہ میں کالج کی جانب سے ہر سال جو مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں گیارہویں سال یعنی سنہ ۱۸۱۲ء میں ان کے کلیات کا ایک نسخہ کالج نے خرید لیا اور ان کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دیا۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کالج کی جانب سے یہ کلیات شائع ہوا تھا۔ مگر اب اس کے نسخے بالکل ناپید معلوم ہوتے ہیں مختلف تذکروں میں کوئی (۲۵) شعر منقول ہیں۔ گلشنِ بے خار کے انتخابی اشعار نموتاً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ شیفتہ کی سخن سنجی نے ان کو پسند کیا ہے:۔

کچھ ترے سلیقے سی پھنسی ہم نہیں صیاد　　　لائی ہے ہمیں دام میں تقدیر ہماری

کسی کی طرف سے آج طپش تجھ کو یاس ہے ۔۔۔ سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اداس ہے
آئے تو ہو کہیں سے آخر ملے وے تم ۔۔۔ کیا ہی اگر مرے بھی لگ جاؤ پھر گلے تم
تم تو کہتے ہو کہ دم کے بعد آجاتا ہے جی ہیں ۔۔۔ پر خدا جانے ہمیں دم کا بھروسہ کچھ نہیں
ہمیں تو اشک کے قطرہ کا بھی ہے تھامنا مشکل ۔۔۔ بھلے وہ لوگ ہیں جن کے تئیں دل تھام آتا ہے

قطعہ

ہر طرف آج ہے بسنت کی دھوم ۔۔۔ سیر میں ہے ہر اک تماشائی
کتنے گلرو جو ہیں بسنتی پوش ۔۔۔ جی میں کھٹکے ہے جن کی رعنائی
کہتے ہیں آن کے مجھے ہنس ہنس ۔۔۔ دیکھ کر میری ناشکیبائی
ہو مبارک تمہیں جنونِ طپش ۔۔۔ پھر نئی رت نئی بہار آئی

شمس البیان فی مصلحات ہندوستان

طپش کا یادگار اور گراں قدر کارنامہ "شمس البیان فی مصلحات ہندوستان" ہے یہ کتاب اردو محاورات اور روز مرّہ پر ۱۷۹۳ء م ۱۲۰۷ھ میں شمس الدولہ رئیس ڈھاکہ کے ایما سے لکھی گئی ہے اور انہی کی خطابی مناسبت سے اس کا نام شمس البیان رکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر غالباً یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور موجودہ معلومات کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے کسی شخص نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس سلسلہ میں سید انشا کی " دریائے لطافت " کا ذکر بھی

ضروری ہے۔ اس کتاب میں قواعد زبان کے علاوہ اہل دہلی کے محاوروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے مگر یہ بھی اس کے بعد کی تالیف ہے۔ اور اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۲ھ ہے شمس البیان ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد سے شایع ہوئی تھی۔ اس کا صرف یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس ایڈیشن کے نسخے اب بالکل نایاب ہیں، ہمارے عنایت فرما مولوی عمر یافعی کے ہاں مولوی میر احمد علی صاحب عصر مرحوم حیدر آبادی تلمیذ حضرت فیض رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۸۲ھ کی ہے۔ مولوی عمر یافعی نے رسالۂ تحفہ حیدر آباد میں اس پر ایک محققانہ مضمون بھی تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ گویا تاریخ تالیف کے (۱۷) برس بعد کا لکھا ہوا ہے۔

اس میں مصطلحات و محاورات کی تشریح و تصریح اس زمانہ کی عام عادت کے موافق فارسی میں کی گئی ہے۔ نفس مضمون سے پہلے ایک فارسی دیباچہ بھی ہے جو ادبی شان سے خالی نہیں اور یہ اس عہد کی فارسی تحریروں کی طرح مقفےٰ طرز میں ہے اس کا کچھ حصہ جس سے وجہ تالیف وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"بعد تحمید حضرت سخن آفرین کہ زبان انسان را بہ انواع مقال قدرت گویائی بخشیدہ و لیس از تحمید نعت خاتم النبین کہ نکتہ

سنجاں دقیقہ رس را بہ فیضان نطق و بلاغت مشرف گردانیدہ
ذرۂ بے مقدار ہیچمدان متخلص بہ طپش مرزا جان معروض رائے
محاورہ دان فصیح زبان و لطیفہ شناسان صحیح بیان گرداند کہ
در خاطر عاطر امیر بلا نظیر........ نواب سپہر جناب امیر الملک
شمس الدولہ سید احمد علی خان ذو الفقار جنگ دام اقبالہ
دعم افضالہ خطور نمود کہ نسخہ مشتمل بر توضیح اصطلاحات و یار
دہلی در روزمرہ فصحائے اردوئے معلیٰ انچہ در بعضے ... اشعار
منظوم می گردد۔ و فہم دوردستان ہر آناں کہ در امصار بعید
واقع اند بہ ادراک کنہش نمی رسد بہ زیور تالیف آراستگی یابد
تا مطالعہ آن انواع کفایت را راحت بخشد و بر طالبان
این فن کار آسان گردد۔ امتثالاً للامرہ تحصیل این سعادت
واجب دیدم و بہ تقدیم ارشاد مصروف گردیدم۔ اما چوں
این نسخہ ایست مبیں مصطلحات ریختہ بہ اصناف لطائف
معنوی آمیختہ لہٰذا بہ رعایت خطاب کار فرما موسوم "بہ شمس
البیان فی مصطلحات ہندوستان" گردید۔ در سنہ یک ہزار
و دو صد و ہفت ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم
در شہر محرم الحرام بتاریخ بست و دوم در بلدہ مرشد آباد
بہ اتمام رسید بر ضمائر ارباب بصائر پوشیدہ نماند کہ
اصطلاحات مرقومہ این نسخہ متنوع است۔ بر دو نوع

نوعے را بہ محاورۂ عوام اختصاص و نوعے از روزمرہ
خواص، علیٰ ای حال ہرچہ در محاورۂ آں دیار مستعمل است
برائے دور دستان مستند وانچہ در روزمرۂ آن بلاد مروج
است عزیزانِ بعید را سند، چہ ہندی عبارت از زبان
موزوں دہلی است پس ہر چہ مطابق آں باشد صحیح وانچہ
درائے انست غلط و قبیح بالجملہ حرفے چند مرقوم نمودؔ
مولف نے نہایت محنت و جانفشانی سے کام لیکر (۲۷۵)
محاوروں کو ردیف وار مرتب کیا ہے اور ہر ایک
محاورہ کی سند میں حتی الامکان شعرائے مشاہیر کے
شعر دیئے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے بھی شعر بطور سند پیش کیے
ہیں سندی اشعار میں سب سے زیادہ تعداد میر تقی میرؔ اور مرزا
رفیع سوداؔ کے اشعار کی ہے۔ مولف نے سندی اشعار پیش
کرنے میں اس تنگ نظری سے کام نہیں لیا جس سے بعض اردو
کے نادان دوست اردو کو صرف دلی اور لکھنؤ کی چار دیواری
تک محدود کر کے بات بات پر زبان پکڑنی چاہتے ہیں۔ مولف
کا مولد و منشا شاہ جہاں آباد ہونے کے باوجود اس نے نہایت
آزاد خیالی اور وسیع النظر کے ساتھ اردو کی فطری آزادی
کو پیش نظر رکھ کر دکھنی شعراء کے کلام سے بھی استناد کیا ہے
ان میں سے چند قدیم دکھنی شاعر جن کے اشعار سنداً پیش

کئے گئے ہیں۔ معتبر خاں عمر اورنگ آبادی ولی اورنگ آبادی سراج، شاہ عزیز، سید عبدالولی عزلت اور سید عبداللہ تجرد ہیں۔ محاوروں کی تشریح اس طرح کی ہے۔

(۱) انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ از بیقراری کہ در عالم رشک لاحق گردد ولی دکنی گوید ؎

شعلہ خو جب سے نظر نہیں آتا — تب سے انگاروں پہ ہے لوٹنے ولی

(۲) رفو جگر میں آنا۔ حیران ماندن بہ مشاہدۂ امر عجیب و عوام بازاری استعمال کنند۔ سراج الدین سراج دکھنی گوید ؎

رفو گر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے — اگر دیکھے مرا سینہ رفو جگر میں آجاوے

(۳) لونی۔ بہ واو مجہول بیائے معروف کنایہ از شورہ بستن دیوار است کہ در ایام برسات بر دیوار گلی عارض گردد۔ شاہ عزیز اللہ عزیز دکھنی گوید ؎

کان نمک ہوا ہوں ترا حسن سبز دیکھ — لونی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

بہار دانش طپش نے میر حسن کی سحر البیان کے طرز پر ایک طویل مثنوی "بہار دانش" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ طپش کا شاہکار ہے اور اس میں انہوں نے اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے۔ محاسن ظاہری اور انداز بیان میں بالکل میر حسن کی تقلید کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن

کی مثنوی کو بہت جلد مقبولیت عامہ حاصل ہو چکی تھی اور لوگ اس کی تقلید میں مثنویاں لکھنے لگے تھے اس مثنوی میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ ابتداءً شیخ عنایت اللہ بنگالی نے فارسی نثر میں لکھا تھا اور وہ خوب مشہور ہو چکا تھا۔ طپش نے جیسا کہ ان کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے بقائے اسم و شہرت عام کے خیال سے اسی فارسی قصہ کو اردو میں نظم کیا ہے۔ شروع میں حمد و نعت کے بعد صاحبان عالیشان گورنر بنگال اور اراکین کونسل ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعریف اور افادات کالج کے عنوان سے فورٹ ولیم کالج اور اس کے پرنسپل اور معتمد کا تذکرہ کیا ہے۔

پھر اصل داستان شروع کی ہے جو قدیم مطبوعات کالج کی طرح ٹائپ کے حروف کے (۲۷۰) صفحات پر مشتمل ہے اس کی تاریخ تالیف ۱۲۲۱ھ م ۱۸۰۶ء ہے اور اختتام داستان پر طپش نے خود نظم میں اس طرح بیان کی ہے۔

ہوا جس گھڑی ترجمہ یہ تمام | بہ طرز لطیف و بہ حسن کلام
طپش نے وہیں فکر کر ایکبار | کہی اسکی تاریخ "باغ و بہار"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سال کی تین مولفات (۱) باغ و بہار میر امن (۲) نور انظار صبح عوض زرین (۳) بہار دانش کی تاریخ اس مادہ سے نکلی ہے میر امن نے تو ہمنام وہم تاریخ کہہ کر اپنی کتاب کو اسی مادۂ تاریخ سے موسوم کر دیا۔

بہار دانش سب سے پہلے ۱۲۵۸ھ میں کلکتہ کے محمدی پریس میں طبع ہوئی اس ایڈیشن کے نسخے آج کل بہت ہی نایاب ہیں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ایک نسخہ نظر سے گذرا جو کسی قدر کرم خوردہ ہے۔ ہمارے پیش نظر ایک اور نسخہ بمبئی کا مطبوعہ ہے اس کا سنہ طباعت ۱۳۱۲ھ ہے۔ لکھنؤ سے بھی ایک ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں شایع ہوا تھا آج کل اس کے نسخے بہت مشکل سے دستیاب ہو سکتے ہیں مؤلف خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ بہار دانش، کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے مگر ہم کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ترجمہ کس نے کیا اور کہاں سے شایع ہوا۔

مثنوی میں شاعر نہایت آزادی کے ساتھ جذبات و احساسات کے ساتھ واقعات و مناظر بھی بہ احسن الوجوہ پیش کر سکتا ہے اور مثنوی کی خوبی بھی ان دونوں بیانات کے بہترین ہونے پر منحصر ہے۔ میر حسن کی مثنوی کو جو قبولیت حاصل ہے اس کا راز اسی میں پنہاں ہے طپش نے بھی کوشش کی ہے کہ جذبات کی محاکات و کیفیات و مناظر کو بہتر پیرایہ میں پیش کریں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ دقایع نگاری کے لحاظ سے ان کے بیانات نہایت عمدہ ہیں۔ یہ موقع تفصیل کے ساتھ تخلیقی تنقید کا نہیں نمونہ کلام پیش ہے۔

سنو آگے تم اب ادھر کا بیاں پدر مہر بانو کا ہو شادماں

اہالی موالی سے اپنے کہا — کہ نقار خانہ میں دو حکم جا
کہ نوبت دھریں آج سے بیاہ کی — کہ شادی ہے اس غیرتِ ماہ کی
محل میں بھی ہیں گائنیں جو تمام — مچادیں بدھاوے کی اب دھوم دھام
کرو شہر کو یکسر آئینہ بند — کہ دے روشنی لطف جس کی دو چند
امیروں کو تو ہے بنے رنگ رنگ — شتابی کرو بس نہ ہووے درنگ
زری بادلے کے بچھیں فرش سب — تکلف کے خلعت ہوں تیار اب
صندوقچے جواہر کے بھی وا کرو — جو مطلوب ہے سب مہیا کرو
جب ارکانِ دولت یہ لائے بجا — اور اسباب سب کچھ مہیا کیا
تو بھیجا ملک زادہ کو پھر پیام — کہ اے شاہ فرخندہ والا مقام
معین ہے اب ساعت سعد کل — بس اب کل کرو رونق آ کر محل
جلوس تزک کا جو سامان تھا — وہ سب کچھ ادھر سے روانہ کیا
ملک زادہ بس وقت موعود پر — رفیقوں کے تئیں اپنے سب جمع کر
براتی ہر اک کو بخوبی بنا — بنا آپ دولھا بہ ناز و ادا
گیا دھوم سے اور بڑے اوج سے — اسی لاؤ لشکر اسی فوج سے
اٹھے بہر تعظیم امیر و وزیر — گئے آگے لینے صغیر و کبیر
لگی تھی جہاں مسندِ زر نگار — بٹھایا وہاں لا کے با اقتدار
طوائف جو تھیں پھر رہیں ناچتی — لگیں ناچنے اٹھ کے انداز سے
گھڑی چار باقی رہی جبکہ رات — تو . . . کو پڑھ مہربانو کے سات
چھپی ہوئی بلائیں کہیں لیتی ساس کی — کہیں سمدھنیں پھر رہیں آس پاس

فوج لے کر محل میں شتاب — وہاں کی کہوں آگے کیا آب و تاب
بصد عزم مسند پہ رکھا قدم — ہوا بر طرف دل سے اندوہ غم
کسی طرف کو گائنوں کا ہجوم — کسی طرف لوٹے سلونے کی دھوم
دلہن کو بٹھایا جو پھر لا کے پاس — عجب طرح کی مہکی اسوقت باس
کہ صدقہ ہوا اس پہ سے صدقے بوگل — کہاں گل نے پائی یہ بو باس گل ۱؎
پھر اس میں جو شربت کا پرچا ہوا — مزہ اور ہی کچھ دوبالا ہوا
بڑے پھر گلے میں جو پھولوں کے ہار — مبارک سلامت مچی ایک بار
گھڑی ایک دو جب رہی باقی رات — تو رخصت کی پھر آن کر ٹھہری بات
اٹھا گود میں اپنی دلہن کے تئیں — ملک زادہ نکلا محل سے وہیں
بجاتا ہوا نوبتیں شان سے — رہا پھر اسی باغ میں آن کے

یوسف زلیخا کہا جاتا ہے کہ طپش نے فارسی کے مشہور قصہ یوسف زلیخا کو بھی اردو میں نظم کیا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کی کب لکھا۔ ہمیں اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانوں میں بھی اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اور ہم تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ طپش نے یہ قصہ بھی نظم کیا ہے۔

۱؎ قافیہ ؟

مرزا کاظم علی جواںؔ

مرزا کاظم علی المتخلص بہ جواںؔ بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں ہیں وہ دہلی کی باشندے تھے۔ ان کے آباو اجداد اور خاندانی حالات کا کچھ علم نہیں۔ دہلی کی تباہی کے بعد اور شرفا و نجبا کی طرح یہ بھی آوارہ وطن ہوے اور ایک زمانہ تک مختلف مقامات پر تلاش معاش کرتے رہے بالآخر لکھنؤ میں جہاں شعراء اور ادیبوں کی اچھی قدر دانی تھی۔ جا پہنچے وہاں مشاعروں میں غزلیں پڑھنے اور داد تحسین حاصل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مشہور شعراء میں شمار ہونے لگا۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے اپنے تذکرہ گلزارِ ابراہیم مولفہ ۱۱۹۸ھ میں لکھا ہے کہ کاظم علی ان دنوں لکھنؤ میں رہتے تھے اور اپنی غزلیں اور دیگر اقسام کے نمونے ان کے پاس بھیجے تھے غالباً یہ ان کے تذکرہ کے لیے اپنا نمونہ کلام بھیجا ہوگا۔ منشی کریم الدین مولف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے ۱۱۹۶ھ میں انہیں لکھنؤ میں دیکھا ہے کاظم علی عربی فارسی کے علاوہ برج بھاشا میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ٹھیک طور پر معلوم

نہیں کہ شاعری میں انہیں کس سے تلمذ حاصل تھا۔

کرنل اسکاٹ رزیڈنٹ لکھنؤ نے جو کاظم علی کے تبحر علمی سے واقف تھے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی مدرسی کے لیے ان کی سفارش کی اور ان کو بھی میر شیر علی افسوس کی طرح وہاں ملازم کروا دیا۔ کالج سے تعلق پیدا ہونے کے بعد کاظم علی نے کلکتہ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور یہیں کے ہو رہے اور غالباً وہیں انتقال کیا ہوگا ان کا سن وفات تو معلوم نہیں مگر منشی بینی نارائن جہاں نے دیوان جہاں میں جو ۱۸۱۲ء م ۱۲۲۷ھ میں تالیف ہوا ہے ان کو بقید حیات بتایا ہے اس کے علاوہ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے شیخ حفیظ الدین کی خرد افروز کی نظر ثانی کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ نہ صرف بقید حیات تھے بلکہ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دینے کے قابل تھے ان کے دو بیٹے بھی اپنے باپ کی طرح اچھے عالم اور کلکتہ کے مشہور شاعر تھے یہ تینوں باپ بیٹے کلکتہ میں شعر و شاعری کا بازار گرم رکھتے تھے اور اکثر مشاعرے منعقد کر کے اپنا کلام سناتے اور دوسرے شعراء کو بھی اپنے افکار طبع کے اظہار کا موقع دیتے تھے۔ ان کے بیٹوں کے نام دیوان جہاں میں مرزا قاسم علی ممتاز اور مرزا ہاشم علی عیاں لکھتے ہیں۔ خود فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ہر سال غالباً

۲۵ر جولائی کو نہایت اہتمام کے ساتھ مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا۔
وہاں کے تقریباً تمام شعراء اس میں حصہ لیتے تھے۔ ۱۸۱۵ء میں ایک
ایسے مشاعرے کی غزلیں دیوانِ جہاں میں بطور ضمیمہ مندرج ہیں
اور ان میں جواں اور ان کے دونوں بیٹوں ممتاز و عیاں کی
غزلیں بھی ہیں۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا ہے
مولف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا حال تو بیان کیا ہے
اشعار نہیں دیے اور صرف یہ لکھ دیا ہے۔ کہ اغلب ہے کہ
جواں کا دیوان بھی مرتب ہوا ہو۔ دیوان بالکل لاپتہ ہے اور
ممکن ہے کہ وہ مرتب ہی نہ ہوا ہو یا مسودہ کی صورت ہی میں۔
دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا ہو۔ کیوں کہ مولف گلشن ہند مرزا
علی لطف نے ان کا ذکر اپنے تذکرہ کی جلد اوّل میں نہیں کیا
اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے اس میں صاحب دیوانِ شعراء
کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اگر جواں کا دیوان ۱۸۰۱ء میں مرتب
ہو گیا ہوتا تو شیر علی افسوس کی طرح ان کا ذکر بھی اس تذکرہ میں
کیا جاتا۔ بہر حال دیوان کا کچھ حال معلوم نہیں البتہ دوسری تالیفات
کے قلمی نسخے یورپ کے مشہور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

سکنتلا ناٹک

کاظم علی نے غالباً آخر ہی عمر تک تصنیف و تالیف
کا مشغلہ جاری رکھا اور کئی کتابیں لکھیں ان کی
پہلی کتاب "سکنتلا ناٹک" ہے۔ کالج کی ملازمت میں داخل ہو کر

انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ۱۸۰۱ء میں ہندی کے مشہور ڈرامہ سکنتلا کو اسی نام سے اردو میں ترجمہ کیا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ۱۸۰۳ء میں گل کرسٹ کے "دبیاض ہندی" میں اس کا ایک طویل اقتباس شائع ہوا۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۰۴ء میں ہوئی۔ اور اس وقت جوان نے اس کی نظر ثانی کر کے تھوڑا سا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس دیباچہ میں اپنا حال اور سکنتلا کے ترجمہ کرنے کا ذکر اس طرح بیان کیا ہے۔

کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں انہوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہ کے ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتہ کو روانہ کیا۔ ان میں احقر بھی یہاں وارد ہوا اور موافق حکم حضور خدمت میں مدرس مدرسہ ہندی کی جو صاحب والا مناقب جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہ، ہیں شرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن انہوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکنتلا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو اور للو لال جی کب کو حکم کیا بار نا غہ لکھا یا کرے اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی۔ لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا بہت

سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا ان دنوں میں کہ سنہ ۱۲۱۸ء ہیں۔ اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے۔ صاحب مدوح نے فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجالائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔

یہ ڈراما اصل میں سنسکرت میں تھا اور اس کا مصنف سنسکرت
کا مشہور و مقبول شاعر کالیداس ہے اور مقبولیت کا باعث بھی اسکا یہی کارنامہ کالیداس ہے اور
اس کی شہرت و مقبولیت کا باعث بھی اس کا یہی کارتامہ ہے ہندی میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے کاظم علی نے نواز کبیسور کے ہندی ترجمہ سے اپنا اردو ترجمہ مرتب کیا ہے اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواز کبیسور نے فرخ سیر بادشاہ (سنہ ۱۱۲۴ھ تا سنہ ۱۱۳۱ھ) کے ایک فوجی سردار مولے خاں ولد خدائی خاں کے حکم سے لکھا ہے اور مولے خاں نے جس کو جنگی کارگزاری اور ایک لڑائی جیتنے کے صلہ میں عظیم خاں کا خطاب ملا تھا اپنے خطاب پانے کی یادگار میں یہ ترجمہ کروایا ہے۔ نواز کا مرتبہ نسخہ کبت اور دوہروں میں تھا اور اردو میں اس کا ہوبہو ترجمہ ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ کاظم علی نے اس کی مشکلات کا اظہار کرتے ہوئے جیسا

کہ مولف طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے، مہا بھارت کے انداز میں ترجمہ کیا سارا قصہ نثر میں ہے اور جا بجا دوہرے دل اور کبت کے معاوضہ میں اپنے اشعار لکھ دیے ہیں جس سے قصہ میں جان پڑ گئی اور نفس مضمون کا لطف دوبالا ہو گیا۔

اُردو لٹریچر حال تک ڈراما کے عنصر سے بالکل خالی تھا اب مغربی زبانوں اور بالخصوص انگریزی کے اثر سے چند عمدہ ڈرامے تصنیف اور ترجمہ ہوئے ہیں مگر اس صنف کو ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی کہ یہ ہماری ادبیات کا ایک اہم حصہ قرار دیا جا سکے۔ تاہم جو کچھ بھی ہوا ہے وہ غنیمت ہے اور حالات و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند روز میں اُردو اس ضروری صنف ادب سے کافی مالا مال ہو جائے گی بہر حال کاظم علی کو اس خصوص میں دوسرے ڈراما نویسوں پر ایک قسم کا تقدم حاصل ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ اُردو کو پہلی مرتبہ ڈراما سے روشناس کرایا جس طرح فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی تقلید میں اُردو میں نثر نویسی کا عام شوق پیدا ہو گیا اس طرف بھی توجہ کی جاتی تو اب تک اُردو میں بیسیوں عمدہ ڈرامے موجود ہو جاتے سکنتلا ناٹک کے بہت کم ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ غالباً اس کا دوسرا ایڈیشن وہی ہے جو ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنی کتاب مکالمات کے ساتھ بطور ضمیمہ ۱۸۲۶ء میں لندن

سے شایع کیا تھا تیسرا ایڈیشن بمبئی سے بہمن جی ددساجی نے ۱۸۴۸ء میں شایع کیا اور پھر ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ سے ایک ایڈیشن نکلا آج کل اس کے نسخے بالکل کمیاب ہیں ہمیں ایک عنایت فرما بزرگ مولوی سید ابو محمد صاحب بلگرامی کے کتب خانہ سید علی حسن میموریل لائبریری میں اس کا ایک نسخہ تیسرا ایڈیشن کا دستیاب ہوا ہے ذیل میں اس کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ اگلے زمانہ میں وسواتر نام کا ایک شخص تھا شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہا کرتا اور اپنے طور کی عبادت و ریاضت دن رات کیا کرتا اپنے صاحب کی بندگی میں تن بدن کی کچھ اس کو فکر نہ تھی سوا دبلا پے سے لٹا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ بدن سوکھ کر اس کا کانٹا ہوا تھا ریاضت کے مارے جیتا ہوا انتھا ان دکھوں سے اس کو کبھی ایک دم آرام نہ آتا تھا ان جفا گر کے سوا اٹھانے کی کوئی کام نہ تھا۔ اس خاکساری سے آرزو دل کی بر آوے اور درخت سے مدعا کے پھل پاوے ایسا جوگ کیا ایسا آسن بیٹھا نزدیک تھا کہ بندگی کے زور سے اندر راجہ کی سنگھاسن چھین لے جتنے تیرتھ تھے ان سب میں گیا۔ شہر شہر دریا دریا گھاٹ گھاٹ پھرا کرتا پھر چھوڑا کسی ندی کا کنارا جس جنگل میں کسی درخت تلے ذرا بیٹھتا گردا گرد آگ جلاتا پھر اپنے تئیں الٹا لٹکاتا دم بدم دھواں منھ میں لیا کرتا تپشیا اس طرح کیا کرتا غرض اس تپشوی

کا یہی حال تھا۔ آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا چونسٹھ برس تلک وہ بیابان نورد تھا سر سے لگا کر پاؤں تلک گرد گرد تھا۔ بناسپتی کھاتا رہتا بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور روبہ آفتاب ہو کر۔

گرمیوں میں دو جگہ تفتہ جلا کر گرد آگ بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام و سحر ایسی باتیں سن کر راجہ اندر کو بہت سوچ پڑا اور دل میں ہوا اس کے اس جوگ کو توڑنے کے لیے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی اور یہ احوال ظاہر کیا وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما، بشنو، مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جائیں۔

جو وے ہوویں وحشی تو کرلوں میں رام میری یاد میں بھولیں سب اپنے کام لیے ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں ہے دیکھ کر ان کو شدھ بدھ کہاں۔

یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو رکھوں پاک دامن میں کب اور کو وسوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کرلوں۔

تمام عمر کو خشقہ کی جاگہہ یہ کلنک کا ٹیکا ماتھے پر دھروں

جو گی یا جھنی تین طبق میں کون ایسا ہے جو مجھسے آپ کو بچا لے اس کو تو میں ایک دم میں اور کا کچھ اور کر دوں قسم ہے مہاراج کی اگر اس کام کے جس کو انگلیوں پر نہ نچاؤں تو اپنا نام منو کا نہ رکھوں۔ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا قس پر سولہ سنگار بارہ ابھرن جو اس سے سر سے پاؤں تلک کے دن کو تو سورج اس کا جلوہ دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا اور رات چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا۔"

شکنتلا کی مثال ایک سدا بہار پھول کی ہے جس کی خوشبو وحسن کو کبھی زوال نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ کالیداس اس کے مصنف اور خود مرزا کاظم علی جو اس کے مترجم کی شہرت بھی اس کے بدولت ہے کاظم علی کی زبان سلیس اور صاف ہے کہیں عبارت مقفیٰ ہے جس سے تکلف پیدا ہو گیا ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہونے کی وجہ سے مقفیٰ عبارت کا عیب کسی قدر چھپ جاتا ہے۔

اور لطف کے تذکرہ گلشنِ ہند کی عبارتوں میں جو تعقید اور تکلف نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ اس میں نہیں ہے مترجم نے جا بجا اپنے اشعار سے کتاب کا لطف بڑھانے کی کوشش کی ہے اگرچہ ان کی شاعری معمولی درجہ کی ہے مگر بعض جگہ واقعی ان کے اشعار بر

محل اور بے لطف ہیں اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ٹھونس ٹھانس دیا ہے۔ اور اس سے اصل عبارت کی حسن و خوبی میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے ہندی کے الفاظ کا استعمال بڑی فراخ دلی سے کیا ہے مگر وہ ایک حد تک اس میں معذور ہیں چونکہ وہ ہندی زبان کی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اور کتاب بھی ایسی جس میں ہندی ادبیات کی تلمیحیں اور ہندوانی رسومات و عقائد وغیرہ کا بیان ہے ایسی صورت میں ترجمہ کا ہندی الفاظ سے بالکل خالی ہونا سخت مشکل بلکہ نا ممکن ہے تاہم کاظم علی نے اس کے استعمال میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور مظہر علی ولا کی بیتال پچیسی کی طرح جا و بے جا ہندی الفاظ کی بھر مار سے احتراز کیا ہے۔ ان کی سلامت روی سے کتاب کا حسن دو بالا ہو گیا ہے۔ اور ہندی الفاظ اکثر و بیشتر موقعوں پر اپنی جگہ نہایت برمحل اور مستحسن ..... نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ کاظم علی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ترجمہ میں للو لال کوی نے ان کی مدد کی ہے اور نواز کبیشور کے دوہرے اور کبت ان کو تفہیم کراتے گئے ہیں شکنتلا کے قصہ کو اردو میں اور بھی لوگوں نے منتقل کر لیا ہے۔ ان میں سے دو قابل ذکر ہیں ایک سید محمد تقی ہیں جنھوں نے "رشک گلزار" کے نام سے اس قصہ کو اردو فارسی کی مشہور عشقیہ مثنویوں کے طرز پر نظم کیا ہے۔

دوسرا ترجمہ منشی اقبال ورما سحر نے حال ہی میں زمانہ پریس کانپور سے شایع کیا ہے۔ اس کا نام "مثنوی سحر" ہے اور یہ مثنوی "گلزار نسیم" کے تتبع میں لکھی گئی ہے گلزار نسیم کی طرح اس میں بھی بے حد اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے نفس مضمون تو نہیں ہندی قصہ کی اصلیت برقرار نہ رہ سکی "رشک گلزار" میں بھی اختصار ہے مگر "مثنوی سحر" سے کم۔ اقبال ورما اردو کے اچھے اور مشاق شاعر ہیں اپنی قدرت سخن سے کام لے کر اختصار کے باوجود کلام میں تعقید نہ ہونے دی۔

اور نہ زبان کے روزمرہ و محاورہ سے دور جا پڑے انگریزی زبان میں بھی شکنتلا کے کئی ترجمے شایع ہوئے ہیں ان میں سے ایک تو مشہور مستشرق سر ولیم متوفی نے اصل سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے اور کاظم علی جوان نے اس کا ذکر کر کے بطور اعتذار یہ لکھا ہے کہ چونکہ انگریزی ترجمہ تو از کبیشور ہندی ترجمہ سے اس لیے گراں دونوں میں کچھ فرق ہو تو ممکن ہے۔ بارہ ماسہ۔ کاظم علی کا دوسرا کارنامہ بارہ ماسہ یا دستور ہند ہے یہ ایک طویل نظم ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے تمام تہواروں اور عیدوں کے جذبات کو بالتفصیل مثنوی کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس کے بارہ حصے ہیں اور ہر حصہ میں مہینہ کے تمام مروجہ ہندوانی اور اسلامی

تیو باروں کا ذکر ہے اس لئے اس کا ہندی نام بارہ ماسہ رکھا گیا ہے تمہید کے بعد ۱۸۵۹ء کے مشہور قرآن شمس و قمر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کو علم نجوم میں بھی دخل تھا یہ منظوم رسالہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوا اور ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا ہم کو جوآن کے بارہ ماسہ کا کوئی نسخہ نہ مل سکا۔ البتہ تین مختلف لوگوں کے بارہ ماسہ دستیاب ہوئے ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی شعرائے نے قصیدہ غزل وغیرہ کی طرح ایک صنعت شاعری بنالیا تھا اور تفنن طبع کے طور پر کچھ نہ کچھ کہہ کر بارہ ماسہ لکھنا ضرور سمجھتے تھے۔

"بارہ ماسہ" کی تصنیف کے بعد جوآن ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے قرآن مجید کے ترجمے کے کام میں لگ گئے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے بھی چند پاروں کا ترجمہ کیا ہو۔ مگر نہ تو ان کے ترجمہ کئے پارے موجود ہیں اور نہ کسی بیان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کتنا ترجمہ کیا سکنتلا کے دیباچہ کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے اس میں جوآن لکھتے ہیں کہ وہ ۱۸۰۴ء میں قرآن شریف کے ترجمہ کا محاورہ درست کرتے تھے اسی سال ڈاکٹر گل کرسٹ انگلستان چلے گئے۔

اور ان کے علیحدہ ہوتے ہی ان کے جانشینوں نے۔

اس کام کو سرے سے موقوف ہی کر دیا اور جو کچھ ترجمہ ہوا تھا اس کی اشاعت نہ ہو سکی البتہ خوش قسمتی سے مولوی امانت اللہ نے جو حصہ ترجمہ کیا تھا وہ کسی اور شخص کے سعی سے شائع ہو چکا ہے اور اس کا ایک نسخہ بمبئی میں محفوظ[1] بھی ہے غرض یہ بتانا تاکہ جوان نے کچھ ترجمہ بھی کیا ہے یا صرف دوسروں کے ترجموں کی نظر ثانی اور محاورے درست کرنے کا کام انجام دیتے رہے۔

تاریخ فرشتہ اس کے علاوہ جوان سے ۱۸۰۹ء میں تاریخ کے ایک بڑے حصے کا بھی جو سلاطین بہمینہ کے متعلق ... ہے ترجمہ کیا تھا معلوم نہیں یہ شائع ہوا یا نہیں فرشتہ کے مروجہ اردو ترجمے دوسرے اشخاص کے ہیں جوان نے اپنی تالیف و تصنیف کے علاوہ شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے اور اپنے دیگر معاصرین کی تالیفات میں بھی مدد دی ہے اس کی اجمالی کیفیت حسب ذیل ہے کالج کی جانب سے ولی میر سودا اور سوز کے دواوین کے انتخاب شائع کئے گئے ہیں۔

ان میں سے کلیات میر کا انتخاب مرزا کاظم علی نے مولوی محمد اسلم منشی غلام خاور مرزا جان طپش کے اشتراک عمل سے مرتب کیا۔

---

[1] مولوی امانت اللہ کے حالات میں اسکا نمونہ دیا جا چکا ہے۔

نیز کلیاتِ سودا کا انتخاب بھی کاظم علی نے اور نثیر علی نے کیا ہے یہ دونوں انتخابات شائع ہو چکے ہیں اوّل الذکر کا سنہ طباعت ۱۸۱۱ء اور آخر الذکر کا سنہ ۱۸۱۰ء ہے ہمارے پاس یہ دونوں کتابیں ہندوستانی پریس کلکتہ کی مطبوعہ ٹائپ حروف میں موجود ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کرنے والوں نے نہایت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ اور میرؔ و سوداؔ کے ضخیم کلیاتوں کا ایسا اچھا انتخاب کیا ہے جو ان کے سارے انتخاب کا نچوڑ ہے اور جس کے مطالعہ سے حشو و زوائد میں تضیع اوقات کے بغیر ان دونوں شاعروں کے کلام کی روحِ رواں کو آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۰۵ء میں جوانؔ نے شری للولال کوی کو سندر کبیشور کی کتاب سنگھاسن بتیسی کے ترجمے میں مدد دی۔ للولال کوی بھی فورٹ ولیم کالج میں بھاشا کے مترجم تھے۔ ان کا حال ہم نے علیحدہ عنوان سے لکھا ہے۔ سنگھاسن بتیسی میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت کے بتیس سبق آموز اور نتیجہ خیز قصے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا

تفصیلی ذکر بھی للو لال کے سلسلے میں بیان ہو رہا ہے۔ جو آن
نے ۱۸۱۵ء میں کپتان ٹامس روبک کے ایما سے مولوی
حفیظ الدین کی کتاب 'خرد افروز' کی بھی نظر ثانی کی تھی اس کے علاوہ
بھی انھوں نے بہت سی کتابوں کی ترتیب و اشاعت میں حصہ لیا
ہے۔

شیخ حفیظ الدین احمد

شیخ حفیظ الدین بھی فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم میں بہت مشہور ہیں لیکن ان کے حالات پر مشہور تذکرہ نویسوں نے کچھ بھی نہیں لکھا ہے خوش قسمتی سے خود انھوں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختصراً اپنا ذکر کیا ہے اور منشی کریم الدین مؤلف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے اس کو نقل کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب کا جو نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے اس کے مرتب و ناشر نے بھی ایک کام کی بات بیان کی ہے۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ الدین کے جد اعلیٰ عرب سے ترک وطن کر کے دکن آئے اور وہاں بود و باش اختیار کی دو تین پشتوں کے بعد ان کے پردادا شیخ حسن دکن سے نکل کر بنگال میں سکونت پذیر ہوئے ان کا خاندان کئی پشت تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتا رہا اور کئی بزرگ صاحب رشد و ہدایت گذرے ان میں سے ایک شیخ سعدی عرف شاہ پیراں قدس سرہ تھے جو حضرت شاہ عنایت اللہ کے مرید اور تربیت یافتہ تھے شاہ عنایت اللہ صاحب حضرت شاہ عبداللہ

صاحب کرمانی رحمۃ نامی بزرگ کی اولاد میں بڑے زاہد
و مرتاض حسن بزرگ تھے۔ حفیظ الدین کے آباؤ اجداد میں
ان کے والد شیخ جلال الدین محمد ابن شیخ محمد ذاکر محمدی انھی نے پیشۂ
ملازمت اختیار کیا اور کلکتہ کے مدرسہ میں جو وارن ہیسٹنگز
گورنر جنرل اوّل نے قایم کیا تھا اور جو اس زمانہ میں نیٹو
کالج کے نام سے موسوم تھا مدرس ہوئے وہ عربی فارسی کے
اچھے عالم تھے حفیظ الدین نے اپنے والد ہی کے دامنِ تربیت
میں رہ کر اس مدرسہ میں عربی فارسی کی تحصیل کی اور بیس
سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کر کے روز
گار تلاش کرنے لگے اس زمانہ میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل
نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو ان کی اعلیٰ عربی فارسی
قابلیت کے مد نظر عربی و فارسی کا استاد مقرر کیا اور وہ
اس خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دینے لگے۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے ان سے تدریس و تعلیم کے
علاوہ ترجمہ کا کام بھی لینا چاہا۔ اور عیار دانش کے اردو
ترجمہ کرنے کی فرمائش کی مولوی عبدالحق صاحب اور ان کی
تقلید میں مولف [۲] سیر المصنفین نے لکھا ہے کہ حفیظ الدین
ریذیڈنٹ دہلی کے منشی تھے بعد میں فورٹ ولیم کالج

---

[۱] رسالہ اردو سنہ ۱۹۶۱ء [۲] سیر المصنفین ص ۷۹۔

میں ملازم ہو گئے اور اس بنا پر ان دونوں نے حفیظ الدین کو دھلوی بنایا ہے مگر خود حفیظ الدین اور ان کے معاصر تذکرہ نویس کے بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے علاوہ ازیں مولف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے۔ کہ اس نے ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کو دہلی میں دیکھا ہے اس کی مزید تقویت امی۔ الیسٹ ویک کے بھی بیان سے ہوتی ہے جس نے صاف طور پر بتلا دیا ہے کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر مسٹر مٹکاف ریذیڈنٹ دہلی کے منشی مقرر ہوئے اور ۱۸۱۵ء میں دہلی میں تھے یہ بیانات خود صاحب تصنیف اور معاصرین کے ہیں جن میں شک شبہ کی گنجائش نہیں۔

شیخ حفیظ الدین شاعر بھی تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ جیسا کہ مولف طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے مگر ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا۔ غالباً ان کا کلام دست برد زمانہ سے نہ بچ سکا اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ ان کی شاعری تفنن طبع کی خاطر ہوتی ہو گی اب انکی شہرت صرف ترجمہ عیار دانش کی بدولت ہے۔

خرد افروز اس کا نام "خرد افروز" ہے اور یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں تمام ہوا اس کے دیباچہ میں لکھا

ایک دن قوانین ریختہ کے معلم اوّل..... مدرس ہندی جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ ترجمہ عیار دانش جو فی الحقیقت دانش کی کسوٹی اور آئین کا دستور العمل ہے کہ حقیر نے ان کا حکم بجا لا کر ترجمہ کرنے پر کمر باندھی خدا کے فضل سے حسن و انصرام کو پہنچا اور نام اس کا "خرد افروز" رکھا۔

(۱) بعد اتمام کے تاریخ اس کی — چاہا میں لکھوں لگا کر اپنا جی

(۲) آئی ہاتف سے ندا یوں تو الفور — خرد افروز جہاں یہ ہیگی[1]

مؤلف طبقات الشعرائے ہند کا بیان ہے کہ حفیظ الدین نے کام میں نہایت تن دہی سے توجہ کی اور اپنے فاضل والد کی امداد سے مئی ۱۸۰۳ء میں ترجمہ تمام کر کے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا انھوں نے بے حد پسند کیا اور مترجم کو اس کی محنت کا کافی صلہ دلایا چونکہ ترجمہ کی عبارت صاف شستہ اور چیدہ و لطیف اور ترجمہ مطابق اصل کے ہے۔ اس واسطے اس کی بہت قدر کی گئی مگر خود حفیظ الدین نے اپنے والد کی امداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

عیار دانش اصل میں کلیلہ دمنہ کا قصہ ہے جس کو فارسی میں متعدد لوگوں نے لکھا ہے زیادہ مشہور فارسی ترجمہ ملا

---

[1] خرد افروز مطبوعہ ہارٹ فورٹ ۱۸۵۷ء۔

حسینی الواعظ کاشفی کا ہے جو انوارِ سہیلی کے نام سے مشہور ہے یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ابتدا سنسکرت زبان میں تھا ساسانی فرمانروایان ایران کے عہد میں اس کا فارسی پھر عربی وغیرہ السنہ میں ترجمہ ہوا علامہ ابو الفضل کی عیارِ دانش انوار سہیلی سے یہ لحاظ زبان و طرز و بیان و قصہ کے بہت مختلف ہے انھوں نے یا تو سنسکرت یا قدیم فارسی ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر اپنا ترجمہ مرتب کیا ہے انوار سہیلی کی طرح اس کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی مگر اردو میں غالباً اس کا یہی ایک ترجمہ خرد افروز ہوا ہے۔ البتہ انوار سہیلی کو کئی ایک آدمیوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں اس کے دکھنی ترجمہ بھی ہیں مگر ان کے مترجم کا نام معلوم نہیں اور نہ یہ ٹھیک طور پر معلوم ہو سکا کہ یہ کس زمانے کے ترجمے ہیں فورٹ سنٹ جارج مدراس سے ایک ترجمہ ۱۸۲۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے شایع کیا تھا اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور ایک نسخہ مولوی سید سجاد صاحب پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کے پاس بھی ہماری نظر سے گذرا ہے دوسرا مشہور ترجمہ فقیر محمد خاں گویا کا ہے جو بستانِ حکمت کے نام سے موسوم اور ۱۲۱۵ء میں مرتب ہوا ہے یہی ترجمہ زیادہ مقبول ہے علاوہ

ازیں مرزا مہدی نام کے ایک شخص نے جو کسی کپتان ڈگلس ناکس کے میر منشی ادر (گیا) میں رہتے تھے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے مگر یہ شائع نہیں ہوا دوسرے دو ترجمے محمد عمر علی خاں وحشی نے "ضیائے حکمت" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں اور جان بہاری لال راضی نے ۱۸۹۵ء میں "ارژنگ راضی" کے نام سے شایع کیے ہیں ان میں سے آخر الذکر منظوم ہے منشی کریم الدین نے اپنے تذکرہ میں ایک اور ترجمہ "منتخب الفوائد" نامی کا بھی ذکر کیا ہے۔

حفیظ الدین کا طرز بیان نہایت صاف و سلیس ہے اس میں شوخی و رنگینی مطلق نہیں ہے فصاحت کے ساتھ رنگینی پائی جاتی ہے ان کی نثر زمانہ غدر اور اس کے بعد کے قریبی زمانہ سے ملتی جلتی ہے قواعد زبان اور روز مرہ کی پابندی کے ساتھ الفاظ کا استعمال بہت کچھ آزادی سے کیا گیا ہے نہ ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ نہ فارسی عربی الفاظ کی بھر مار دونوں کا نہایت عمدہ میل ہے سر سید کے اسلوب بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ حالانکہ "خرد افروز" قصوں کی کتاب ہے مگر نفس مضمون کی سنجیدگی کا لحاظ کرتے ہوئے حفیظ الدین نے انشاء پردازی کی بلند پردازیوں اور تشبیہ و استعارہ کے ہیر پھیر سے ہٹ کر

نہایت ہی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس کو لکھا ہے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت نثر میں شاعرانہ نزاکتیں اور تکلف کی آمیزش خاص کمال سمجھی جاتی تھی اور عام مذاق ایسی روکھی پھیکی کتابوں کو پسند نہیں کرتا تھا تاہم "خرد افروز" کو بہت کچھ مقبولیت حاصل ہوئی ابتداً اس کا ایک حصہ دیگر مولفات کی طرح ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنی بیاض ہندی میں شامل و شایع کیا۔

پھر پوری کتاب اہتمام کے ساتھ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی۔
دوسرا ایڈیشن کپتان ٹامس روبک کے اہتمام سے میر کاظم علی جوان منشی غلام اکبر مرزائی بیگ اور منشی غلام قادر کی نظر ثانی و تصحیح کے بعد ۱۸۱۵ء میں شائع کیا گیا اس وقت حفیظ الدین کالج کی ملازمت سے دستبردار ہو چکے تھے تیسرا ایڈیشن بہت ہی اہتمام کے ساتھ ای۔ ایسٹ وک نے ۱۸۵۷ء میں ہارٹ فورڈ انگلستان سے شائع کیا اس میں رسم الخط اور املا کا خاص اہتمام ہے تشریح طلب باتوں کو انگریزی میں فٹ نوٹس کے ذریعہ وضاحت کر دی گئی ہے اس کا ایک نسخہ اسی سنہ کا چھپا ہوا ہے اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے میانوکل نے خردافروز کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے خردافروز میں مترجم "کیفیت" کے عنوان سے ایک طویل پیش نامہ دیا ہے جس میں حمد و نعت کے بعد اپنا حال ترجمہ کرنے کا سبب اور پھر اصل تصنیف کی کیفیت با تفصیل بیان کی ہے اس کے کل ۱۱ باب ہیں پہلے دو باب اصل پہلوی ترجمہ کے مترجم بزرجمہر کے اضافے میں جن کو انوار سہیلی کے مولف نے حذف کر دیا مگر ابو الفضل نے بحال رکھا ہر باب

کے آخر میں "باب کا خلاصہ" کے عنوان سے اس باب کے نفس مضمون اور ماحصل پر بصیرت افروز نظر ڈالی ہے۔

(کتاب کا نمونہ یہ ہے)

حکایت برہمن نے کہا کہ یہ نقل ہے کہ روم کی سرحد میں ایک بادشاہ عالی ہمت بزرگ نفس تھا۔ اس کے دو بیٹے حسین و خوشخو تھے جب بادشاہ نے عالم بقا کے کوچ کا نقارہ بجایا بڑا بھائی دولت بادشاہی بر جبر لے کر چھوٹے بڑے سبھوں کے دل کو ہاتھ میں لایا۔ اور باپ کے تخت سلطنت پر بیٹھا اور خزانہ کا منھ کھول دیا چھوٹے بھائی نے اس ڈر سے کہ مبادا مجھ پر کچھ آفت لاوے وطن چھوڑ کر سفر اختیار کیا اور اکیلا راہ دور دراز کو چلا اتفاقاً ایک جوان نازنین خوبصورت کہ جس نے زمانہ کی گردش سے سفر کیا تھا۔ اس کے ہمراہ ہوا شاہزادے جو اس کے چہرے سے راست بازی دریافت کی اس کی رفاقت سے خوش ہوا دوسری منزل میں ایک دانا سوداگر بچہ ہوشیار کہ جس نے گھربار تج کر سفر کیا تھا ان کو ملا تیسری منزل میں ایک زور آور دہقان بچہ جو کسی باغبان دانا کے

نطفہ سے تھا ان کا فیق ہوا تمام اذیت سفر کی راحت سے
بدلی ہوئی چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے
کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ
حال رہتے تھے دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نطور
میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے کسی
کے پاس خرچ کو کچھ نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے
کہا اب وہ وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلا دے
اور زور بازو سے کچھ بہم پہنچا دے تو چین سے اس
شہر میں چند روز آرام سے رہیں بادشاہ زادے نے کہا
سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں آدمی کی کوشش
سے سرانجام نہیں ہو سکتے جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش
میں نہیں دوڑتے ہیں خوبصورت جوان نے کہا حسن
دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے جہاں
اس کی نمود ہو دولت تابع ہوگی سوداگر بچے نے بھی حال اپنا
ظاہر کر کے کہا حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک نقد
بے بہا ہے اور تھوڑے عرصے میں اس سے کچھ منفعت نہیں
ہوتی ہے رائے صواب و تدبیر درست اور کاروائی و
معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے زیادہ ہے جو بے
سامان اس کو اختیار کر کے جلد اپنے مطلب کو پہنچے

دہقان بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی وکارو رنی سب وقت کام
نہیں آتی ہے اکثر میں نے دانا کو حیراں اور نادان کو کامیاب
دیکھا ہے بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب
ومقصد ور بناتی ہیں اور ہنر وحرفہ عقلمند کے سامان
ودولت کا وسیلہ ہوتا ہے جب پھر نوبت شہزادے کی پہنچی
یاروں نے التماس کیا کہ کچھ اور اس باب میں فرمایئے اس نے
جواب دیا کہ میں اس بات پر ہوں جو میں نے آگے کی تھی۔
اور تم جو کہتے ہو کہ صورت کے وسیلہ اور دانش وکسب
کے سبب سے دولت ہاتھ لگتی ہے۔ میں اس کا منکر نہیں پر
عرض میری یہ ہے کہ یہ سب کام قضاو قدر کے سلسلہ سے متعلق
ہیں حکم الہی کے تابع رہا چاہیئے اور اپنے کاموں کو تقدیر کے
حوالے کیجئے اور خواہش الہی کے منتظر رہئے جس نے ہم کو
پیدا کیا ہے ہماری روزی کے اسباب بھی کر دیے ہیں
خرد افروز مطبوعہ ۱۸۵۷ء ص ۳۱۱

خلیل علی خاں اشک

فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مؤلف ہیں جن کی کتاب تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اس کی بدولت مشہور ہونے کی بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے قصہ امیر حمزہ کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اس زمانہ میں بھی جبکہ اردو زبان نے ترقی کی کئی مدارج طے کر لیے ہیں۔ اور اس میں ناولوں قصوں مختصر فسانوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے امیر حمزہ کے شائق اکثر جگہ نظر آتے ہیں۔ اور اب بھی اس کتاب کی تھوڑی بہت قدر قصہ پسند پبلک کو ہے مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خلیل علی خاں کی محنت شاقہ نے ان کو نام و نمود سے اب تک بالکل محروم رکھا اور شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ان کا نام ان کے اپنے کارناموں کے ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے انھوں نے جس کاوش و محنت سے داستان امیر حمزہ سی ضخیم کتاب جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے لکھی ہے اس کی داد دینا تو کجا آج

تک کسی نے اس خصوص میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا ہم نے اُردو شاعروں کے تقریباً تذکروں کی ورق گردانی کی مگر ان کا حال کسی میں نہ ملا یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے حالات وغیرہ کے متعلق بہت کم معلومات رکھتے ہیں ان کی مؤلفہ کتابیں بھی ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مولوی عبد الحق صاحب مدیر رسالہ اُردو نے "اہل یورپ نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی" ہے عنوان سے جو مضمون فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں پر لکھا ہے اس میں خلیل علی خاں کا ذکر کیا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کہ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامہ علامی ابو الفضل کو واقعات اکبر کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا کیا پھر مولوی محمد یحیٰی صاحب تنہا نے اپنی کتاب میں ان کا جو ذکر کیا ہے وہ سراسر مولوی عبد الحق کے بیان کی نقل ہے۔ اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ ان دونوں نے خلیل علی خاں کو خلیل اللہ خاں لکھا ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر ان کی جو کتاب ہے اس میں صاف طور پر خلیل علی خاں مندرج ہے اور اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہم آگے کسی موقع پر اشک کا وہ بیان نقل کر دیں گے جس سے ان کا اصل نام معلوم ہو سکتا ہے۔

رسالہ اُردو نمبر ۱۵ ص ۳۸۵ سے ۲ سیرالمصنفین ص ۱۳۶

افسوس ہے کہ اشک نے اپنے آبا و اجداد مولد و وطن کے بارے میں ایک الفاظ بھی نہیں لکھا ان کی تاریخ ولادت مقام پیدائش و تعلیم و تربیت تک کا حال معلوم نہیں بہر حال صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے دور اول کے اہل قلم ہیں اُن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی کالج کے تنخواہ یاب منشی نہیں تھے غالباً ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے اپنے طور پر یہ پہلی کتاب مرتب کی ہوگی اور پھر کالج سے متوسل ہو گئے۔ اب تک انکی مؤلفات میں صرف دو ہی کے نام معلوم نہ ہو سکے ہیں ممکن ہے کہ یہی دو کتابیں ان کی یادگار ہوں اور اس کے علاوہ کوئی دوسری تالیف مرتب کرنے کا موقع نہ ملا ہو ان میں سے پہلے قصہ امیر حمزہ ہے یہ طولانی اور ضخیم قصہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا اس قصہ کے اصل مصنف کے متعلق مختلف خیالات ہیں اور کوئی قطعی و یقینی ...... رائے قایم کرنا مشکل ہے ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ یہ مشکل قصہ سلطان محمود غزنوی ۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء کے خوش کرنے اور اس فاتح کو ملک گیری و کشور کشائی کے لئے آمادہ و تیار رکھنے کے لئے کئی ایک راویوں اور داستان نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا ہے ایک اور موقع پر اشک نے بھی اسکو ملا جلال

بلخی سے منسوب کیا ہے برٹش میوزیم میں ایک فارسی نسخہ محفوظ ہے اس میں اس کا مصنف شاہ نصیرالدین احمد کو بتایا گیا ہے ہی میوزیم میں دوسرا نسخہ الوالمعالی کے نام سے منسوب ہے بعض لوگوں نے اس کو فیضی کے تخلیقی دماغ کی پیداوار بتایا ہے۔ غرض وہ مثل ہے جتنے منھ اتنی باتیں ہماری دسترس میں اصل فارسی نسخے نہیں ہیں اور شاید ہندوستان میں بہت ہی کم جگہ فارسی نسخے موجود ہوں گے ایسی صورت میں ہم اس کے اصل مصنف کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر بات بلا تحقیق کے نہیں بیان کر سکتے ہیں مگر یہ بھی شبہ ہے یہ قصہ ابتداءً عربی میں ..... میں لکھا گیا یا فارسی ہی میں تصنیف ہوا۔

خلیل علی خاں اشک اور دیگر ہندوستانی مولفین کے نسخے جو دستیاب ہوئے ہیں ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا کہ اصل نسخہ فارسی میں اتنا طویل نہ تھا ان لوگوں نے اس میں ہندوستانی عنصر کو داخل کر کے اپنا لیا ہے آگے ہم اس پر ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

جیسا ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے۔ اشک نے اس کو ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے اردو میں کسی نے توجہ نہیں کی تھی اور سب سے پہلے اشک نے ہی اس کو صاف زبان نو آموزان اردو کے لئے تالیف کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں "مخفی نہ رہے کہ بیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانہ میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سناتے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں ہر رات ایک داستان حضور میں سناتے تھے انعام و اکرام پاتے تھے۔

اب شاہ علی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق ۱۲۱۵ سنہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالیشان والا مناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلیٰ لکھا تاکہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔ اشک کے نسخے پر بحث کرنے سے پہلے ایک نظر مروجہ اور جدید نسخوں پر بھی ڈال لینی ضروری ہے۔ مروجہ نسخوں میں سب سے پہلے منشی نول کشور کا مرتب کرایا ہوا نسخہ ہے اس کو حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے ترتیب دیا تھا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے تعقید عبارت دور کر کے اردوئے معلیٰ کا جامہ پہنایا یہ نسخہ بہت مقبول ہوا چنانچہ چند ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا پھر دو ایڈیشن اور شائع ہوئے چوتھی مرتبہ نول کشور پریس کے مشہور مصحح سید تصدق حسین مرحوم نے جو عربی فارسی کے بڑے عالم تھے اور جن کی یادگار فارسی کی متداولہ وفارسی لغت لغات کشوری اب تک مقبول دخاص وعام ہے اس کی نظر ثانی کی تصدق حسین لکھنؤ کے باشندے تھے۔ اور ان کی زبان عربی و فارسی سے اس قدر متاثر تھی کہ ان کی ہر عبارت سے عربیت اور رنگینی ٹپکتی ہے انھوں نے

نظرِ ثانی میں اس کو تکلفات و آرائشات لفظی سے فسانۂ عجائب کا جواب بنا دیا اور جابجا اپنی طرف سے اضافہ کیا اور خود بھی بڑے افتخار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ بطور نثر فسانۂ عجائب ترتیب دیا اس سلسلے میں انھوں نے در پردہ خلیل علی خاں کی عبارت کو تعقید سے معمور کیا ہے اور اس کو صاف زبان میں لکھنے کا سہرا عبد اللہ بلگرامی کے سر باندھا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے اشکؔ کی عبارتیں بے حد صاف سلیس ہیں ہم آگے دونوں کی تھوڑی تھوڑی عبارت جو ایک ہی مضمون کے متعلق ہے نقل کر کے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کر دیں گے۔

تصدق حسین کا مصحح نسخہ بھی بہت مقبول ہوا اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ان کا طرز بیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل فسانۂ عجائب کی تقلید ہے اور ان کو خود بھی نہ صرف اعتراف ہے بلکہ اس پر افتخار ہے اس سادگی اور صفائی نام کو نہیں ہے اس نقش کے بعد اس کا مقبول ہونا قوم کی تکلف پسندی اور بگڑے ہوئے مذاق کی دلیل ہے ہر ملک اور قوم کی تاریخ ادبیات میں ایک دور ایسا ضرور ملتا ہے جبکہ ادب سے اصلیت دور ہو جاتی ہے اور بجائے معنوی خوبیوں کے ظاہری محاسن

اور لفظی آرائشات کو پسند کرنے لگتے ہیں صفائی اور سادگی پر تکلفات اور ضائع بدائع کو ترجیح دی جاتی ہے ادب کی ایسا دماغ حقیقی پیداوار سے محروم رہتا ہے۔ اور اس کا لٹریچر ادب عالیہ نہیں بن سکتا اس کی بہار صرف چند روزہ ہوتی ہے اور کاغذی پھولوں کی طرح وہ بھی ایک محدود عرصے تک پبلک کو مرغوب طبع رہ کر فنا ہو جاتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں یورپ اور اس کے مقلدین کی شاعری کا بھی یہی حال ہے فارسی کی متاخر غزل گویوں کی بھی یہی کیفیت ہے خیالات میں اصلیت سادگی اور جوش مفقود ہے صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جس میں تاثیر نہیں اسی طرح فارسی کے متاخر نثر نویسوں کے کارنامے بھی اصلیت سے دور ہیں چنانچہ مقالہ نظامی عروضی "سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور رسایل طغرائے مشہدی کو ہمیشہ ہرگز فروغ حاصل نہیں ہو سکتا ایک میں بقائے دوام کے آثار ہیں۔" اور دوسرے میں چند روز لطف اور موقتی پسندیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں اردو میں سرور کے فسانۂ عجائب اور حسین کی مسجع داستان امیر حمزہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے جس طرح اردو شاعری کا مذاق بگڑتے بگڑتے صرف لفاظی اور نقالی رہ گئی نثر نویسی بھی اس قعر

میں گر پڑی اور چونکہ ایک زمانہ میں رنگینی طبع اور غفلت سے یہی طرز بیان مقبول تھا۔ ان کتابوں کو بھی مقبولیت مل گئی مگر اب علوم جدیدہ ترقی کے ساتھ قوم کے مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی ہے اور اس قسم کی کتابوں سے عوام کو وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی اسی داستان امیر حمزہ کو لیجئے اب سے گیارہ سال پیشتر اس کا بارہواں ایڈیشن شایع ہوا تھا دوبارہ اب تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی اسی ایڈیشن کے بیسوں نسخے قطعے فروشوں کے یہاں پڑے ہوئے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں حالانکہ اس سے پیشتر اس کتاب کی اس قدر مانگ تھی کہ چند ہی سال میں اسکے گیارہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکلے اس کے برخلاف خلیل علی خاں کا ترجمہ سیدھی سادھی زبان سلاست اور صفائی کا اچھا نمونہ ہے اس کی عبارت گنجلک اور تعقید سے پاک ہے۔ اور اس کی سادگی اور صفائی میں اس کی دل کشی کا راز پنہاں ہے مگر قوم کا مذاق بگڑ جانے سے اس کی مقبولیت نہ ہوئی اور اب تک تصدق حسین والا ترجمہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رہا اگرچہ اب قدیم قصوں کی طرف سے ان کی فوق العادت اور خلاف فطرت باتوں کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے مگر اتنک گئے قصہ امیر حمزہ اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں میں ایسے جوہر ضرور موجود ہیں جو پھر

ایک بار ان کی مقبولیت دلا سکتے ہیں جب افسانہ کا اچھا ہو گا تو بہ لحاظ اصلیت و سادگی ان قصوں کو بعد کی مرصع اور پر تکلف کتابوں پر ترجیح حاصل ہو جائے گی اور خود اس وقت بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آج کل فسانۂ عجائب کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو باغ و بہار کو ہے خلیل علی خاں کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے میر امن اور شیر علی افسوس کی طرح دہلی کے ٹھیٹ محاوروں اور روزمرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ سنجیدہ عبارت آرائی کی ہے زبان میں گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی ہندی اور فارسی الفاظ کا استعمال نہایت مناسب تناسب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اکرام علی کی طرح زبان میں روانی اور صفائی بے حد ہے کوئی فقرہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں معلوم ہوتا بعض الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں اس میں بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے دیگر معاصرین کے .... مقابلہ میں اشک کے ہاں۔ ایسے متروکات کی تعداد بہت کم ہے بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور چھوٹے چھوٹے فارسی ٹکڑے بھی رکھے گئے ہیں۔

مگر ایسی طویل کتاب میں ان سب کا استعمال برا نہیں اس لئے بجائے مصنوعیت پیدا ہونے کے اصلیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ امیر حمزہ کی داستان اردو ادبیات میں

عجیب اہمیت رکھتی ہے پہلے ہی قصہ چار جلدوں میں لکھا گیا ہے منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر نے اس کے مضمون کو طوالت دیکھ کر اور حاشیے چڑھا کر کئی جلدیں طلسم ہوش رُبا کی تیار کیں پھر دوسروں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور شبدیز قلم کی جولانیوں سے طلسم ہفت پیکر طلسم نوخیز جمشیدی ایرج نامہ اختر نامہ وغیرہ خدا جانے کتنے ناموں سے اسس سلسلے کی جلدوں پر جلدیں تیار کیں غرض انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (قاموس العلوم برطانیہ) کی طرح اس سلسلہ کا ایک اچھا خاصہ کتب خانہ ہو گیا اور داستان پسند پبلک کی ضیافت طبع کے لئے اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اس کے مطالعہ کے نذر ہو جائے۔

قصہ امیر حمزہ رجال داستان میں عرب وعجم کے مشاہیر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے ایک طرف امیر حمزہ عمرو عیار اور مقبل گی سیر تیں عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد، اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے بعض۔ رسمیں اور طریقے خالص ایرانی ہیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ابتداءً فارسی ہی میں تصنیف ہوا تھا۔ جیسے اڑتے ہوئے پرندوں میں سے کسی خاص پرندے کو تاک کر تیر مارنا

اور اگر تیر اسی کے لگے تو اس سے اپنے مقصد میں کامیابی وموافق مرام نتیجہ کی فال لینا جس کو فال گوش کہتے ہیں خالص ایرانی دستور ہے اس کے علاوہ ساری داستان میں بہت سی باتیں خالص ہندوستانی بھی ہیں جن سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اردو میں منتقل کرتے وقت مترجم کے دماغ رسا نے یہ اضافے کئے ہیں اور اصل قصے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے مثلاً مدرسہ میں عمرو عیار کی شرارتوں کی جو تفصیل دی ہے وہ سب ایسی شرارتیں ہیں جو نہ صرف ہندوستانی طلبہ میں پائی جاتی ہیں بلکہ خاص اسی ملک کی چیزیں ہیں یا عمرو عیار نوشدارو حاصل کرنے کے لیے مداین جاتا ہے اور وہاں اپنے آپ کو گاؤں کا باشندہ بتاتا اور نوشیرواں سے دیہاتی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس موقع پر قصہ نویس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صوبہ اودھ کے ایک گاؤں کی ہے عمرو عیار کا ایک دفعہ سمندر میں ایک کشتی سے ٹاپو پر کودپڑتا اور پھر ایک موقع پر ساحل پر اترتے ہی تسمہ پا اشخاص کا نظر آنا یہ ٹکڑے الف لیلیٰ سے ماخوذ ہیں اسی طرح سراندیپ کے بادشاہ لندھور لڑنے جانے سے قبل امیر حمزہ کا محل نوشیرواں میں بلایا جانا اور ان کی اس شرط پر کہ فتح و کامیابی کے بعد مہر نگار دختر نوشیرواں سے ان کا عقد کر دیا جائے

ان کو شربت پلانا اور پان کی گلوریاں دینا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں جن سے ایران کو کچھ علاقہ نہیں قصہ نویس نے المقنش وزیر کے اس تخت کی ساخت کا تخیل جو اس نے بادشاہ قباد کے لئے بنایا تھا شاہ جہاں کے تخت طاوس سے لیا ہے غرض پوری داستان میں ایسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے بخوبی واضح ہے کہ یہ مترجم کے حواشی ہیں۔

اس نے اس قصہ کو اپنا لیا ہے۔ یوں تو اس قصہ کے بیشتر حصے رجال داستان میں خوق العادت اور بعض مرتبہ خلاف عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصے کی جان اور مرکز ہے اس کے کردار میں عجیب وغریب گلکاریاں کی گئی ہیں اور اس کو ایسا چالباز مبارز طلب اور ہم باز بتایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ از منہ وسطیٰ کے جنجو نائٹ اور اڈ نجرد کوئی حقیقت نہیں رکھتے مگر اس کے کردار میں شروع ہی بری خصلتیں اور طمع اور چالبازی کے عناصر شامل کر کے اس کی نیکی سے دور بتایا ہے غرض اس سردار عیاران سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کئے گئے ہیں کہ عقل انسانی سے باہر ہیں۔

ذیل میں ہم ایک ہی مضمون کے متعلق اشک اور تصدق

حسینی دونوں کے نسخوں سے ایک ایک بیان نقل کرتے ہیں
ان دونوں میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل اصلی پھول
اور کاغذی پھول میں ہوتا ہے۔

ایک سرتاپا صفائی سادگی اور اصلیت کا نمونہ ہے
اور دوسرا بالکلیہ مرصع مسجع تکلف اور مضمون کا مظہر ہے۔

حکایت یہاں سے دو کلمہ داستان ملک النقش کے ملا خطہ فرمایئے جبکہ وہ باغ تیار ہوا ایک دن۔
بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی
بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظلِ سبحانی وہاں
رونق افروز ہوکر ایک چمچہ آش نوشجان فرمائیں کہ باعث
عزت ازدیاد خانہ زاد ہے۔ مصرع۔

(شاہان چہ عجب گر بنوازند گدارا)

فرمایا کیا مضائقہ تم جاکر تیاری کرو ہم بھی آتے ہیں۔
النقش حضور سے رخصت ہوکر واسطے تیاری کے آگے
گیا بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر
سوار ہوکر اور تمام وزراء و امراء ہمراہ لیکر طرف باغ
بیداد کے رونق افزا ہوئے جبکہ سواری باغ کے قریب
آئی ملک النقش نے ایک تخت ہوادار واسطے بادشاہ
کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل بوٹے لعل اور الماس کے تھے

اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے گئے تھے کہ جنوں کے پیٹ میں لخلخے خوشبو کے رہتے تھے اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا۔

جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سبز تھے اور الماس کے پھول جنوں کی زردی پکھراج کی سی تھی اسکو معہ ہودجوں اور چالیس ہاتھیوں جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کار زری و جواہر نگار انھوں نے پیٹھ پر کسی ہوئیں اور دو سو گھوڑے عربی عراقی ترکی تازی معہ جواہر مرصع اور کئی اونٹ بغداد کے دو کوہانی کہ جن کے کجاوؤں پر کارچوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئیں تھیں اور کتنے خیمے کتنی کشتیاں صلاح کی اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لئے اور باہر کے جلوہ خانے تک استقبال کر کے بادشاہ کو یہ سب نذر گزارنا اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا اور ہمراہ ہوا جبکہ بادشاہ باغ کے اندر گئے دیکھا تو عجب گلزار ہے کہ شاید ایسا نہ ہوگا اس کی وہ چار دیواری سنگ مرمر کی جس میں تمام گل بوٹے کی تحریر اور طرح بہ طرح کی بیل ہے اور نیچے ان دیواروں کے ہر سنہری چنبیلیوں کی دار پشت بنی ہوئی کہ اس میں پتے زمرد کے اور غنچے موتیوں کے لگے ہوئے ہیں اور صاف روشنی سبزہ کا عالم ٹھنڈی ہوا پھولوں کی خوشبو ہر دم جس سے دماغ کو قوت ہوتی تھی کیاریاں اقسام کی گلزار ہر قسم کے پھول

جس میں پھولے ہوئے مثل گل لالہ نافرمان بابونہ گیندا جوہی سوسن چنبیلی موتیا موگرا رائے بیل گلاب سیوتی کلغا گل مہدی گل شبو نرگس داؤدی ہر ایک طرح کی بہار تھی اور دونوں طرف روش کے دو بڑے پیڑ چمپا اور مولسری کے بہت خوبصورت پھولے جنکی تمام ٹہنیوں پر اور شاخوں پر غرارے بادلے چڑھے ہوئے۔ وہ مہندی اور رائے بیل کی ٹٹیوں پر شان وہ چوپڑ کی ہر مثل لوح۔ الماس بلب پانی کے چہار طرف گئی کہ جس کی فواروں پر ہزارہ کی جا طوطے بلبل فاختہ مور عندلیب جواہرات کے بنے ہوئے جن کے پر و بال سے ہزارہ چھٹا ہوا ایک لطف دیتا تھا اور سفید عالم عمارت کا جس میں سنہری روپہلی الماس تراش استادوں پر تمام تمامی کے سائبان کھنچے ہوئے کہ جن میں سراسر موتیوں کی جھالر تھی اور سوتے کی تیلیوں کی مچھیں مینے سے رنگی ہوئیں پوپی داروں پر کلابتو کی ڈوریوں کی زربفت کے پردوں کے ساتھ بندھی ہوئی غرض بادشاہ اس باغ کو دیکھ کر اپنے باغ کو بھول گیا۔

(قصہ امیر حمزہ از شاہ حسین ص ۷)

مخلبدان بوستانِ اخیار چمن پیرایانِ گلستانِ اظہار تختہ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع موقع پر نصب فرماتے ہیں صحن شفاف قرطاس کو گل دریا چین مضامین رنگارنگ بول

رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں۔ کہ جب باغ بیدا و تیار ہوا نمونۂ بہشت شداد نمودار ہوا القش خوشی سے پھول گیا فکر دارین بھول گیا فرط مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا جامۂ تن سے باہر ہوا جاتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ غلام نے حضور کی بدولت و اقبال کے ایک باغ تیار کیا ہے انواع الواع کے درخت ثمردار اور گل بوٹے کے لگائے ہیں۔

دور دور سے بہ صرف زر کثیر نادر درخت منگوائے ہیں باغبان نادر کار نخلبندی میں ہوشیار بہم پہنچائے ہیں ہزار ہا روپیہ صرف کر کے سینکڑوں استاد اس فن کے بلوائے ہیں۔

ہر ہر شخص یکتائے زمانہ ہے اپنے اپنے ہنر میں یگانہ بیل بوٹے ایسے لگائے ہیں کہ مانی و بہزاد اپنی صنعت سے شرمائے ہیں مگر جانثار کی نظروں میں سماتا نہیں خزاں کا رنگ باغ میں معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی کا قدم مبارک اس میں جاتا نہیں ناسخ

...... سرسبز ہو جو سبزہ تیرا پائمال ہو ٹھہرے جس تو شجر کے ...... تلے وہ نہال ہو امیدوار ہوں کہ حضرت خاقان جہاں نوشیرواں زماں بطریق گل گشت کبھی اس طرف توجہ فرمائیں خانہ زاد موروثی کا رتبہ فلک اعظم تک پہنچائیں حضرت کے قدموں کی برکت سے باغ میں بہار آجائے ہر گل غنچہ اپنا اپنا رنگ دکھائے

از راہِ غلام نوازی اگر دو یک میوے نوش فرمائیں غلام کو ثمر مراد حاصل ہو۔ اشجار امید بار لائیں بادشاہ نے اس کے التماس کو قبول فرمایا معروضہ اس کا درجۂ اجابت میں لایا القش نے تسلیم بجا لاکر نذر گزاری رخصت ہوا باغ میں آکر سامان دعوت کرنے لگا آناً فاناً سب اسباب ضیافت کا مہیا ہو گیا اقسام اقسام کے کھانے تیار ہونے لگے طرح طرح کے کھانے کشتیوں میں چنے گئے ارباب نشاط کو حاضری کا حکم ہوا آتش بازوں نے آتش بازی کا موقع ڈھونڈھ رکھا روشنی کا سامان ہونے لگا ہزار ہا گلاس چڑھ گیا جھاڑ فانوس دیوار گیریاں صاف ہونے لگیں۔

موی کافوری شمعیں چڑھائی گئیں تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جم جاہ فلک رفعت خورشید طلعت دادگر انصاف قدر معہ ارکان دولت و اعیانِ سلطنت بہار افزائے باغ بید ادہوا القش کا شجر مقصود بار لایا۔

(داستان امیر حمزہ از تصدق حسین ص ۱۵)

اشک کے نسخے سے اوپر جو ہم نے حکایت نقل کی ہے وہ ان کی رنگین بیانی کا بہترین نمونہ ہے اور ساری کتاب میں اس سے زیادہ مرصع اور رنگین بیان کوئی نہ ملے گا مگر تصدق حسین کے نسخہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے ہم نے قصداً اسی

پر اکتفا کیا اور یہ بھی طویل ہے اس کے بعد تخت اور باغ کا
جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ ہم کو بخوف
طوالت چھوڑ دینا پڑا اس کی رنگینی و آرائش کے لئے یہ کہنا
کافی ہے ۔

ع - قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ع - اشک کا دوسرا اور قابل ...... قدر کارنامہ "واقعات اکبر"
ہے انھوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایماء سے علامی
ابو الفضل کی مشہور کتاب اکبر نامہ کا اردو میں اس نام سے ترجمہ
کیا تھا یہ بد قسمتی سے شایع نہیں ہوا یورپ کے بڑے بڑے کتب
خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے یا مسودہ موجود نہیں ہیں اکبر نامہ
جیسی مفید اور اہم کتاب ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ا
ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا یہ ترجمہ دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے
یا نہیں اگر یہ کتاب دریافت و شائع ہو جائے تو ہماری تاریخ
کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہو گا۔

خلیل علی خاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ہے کہ خود
شاعر ہو نگے اس زمانہ میں شاعری کا گھر گھر چرچہ بھی ان کے شاعر یا
ناظم ہونے کا خیال پیدا کرتا ہے اول تو ان کا ذکر ہی کسی تذکرہ
میں نہیں پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے ان کا کوئی دیوان

نہیں جس دو چار شعر مل سکیں قصہ امیر حمزہ میں کہیں کہیں ایک آدھ ان کا طبع زاد شعر مل جاتا ہے مگر وہ ان کی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہو سکتا اتنا ضرور ہے کہ وہ بہت ہی پست درجہ کے شاعر تھے اور ہم ان کو ناظم یا قافیہ پیما کہہ سکتے ہیں ان کا یہ حال معلوم ہوتا ہے کہ تفنن طبع کے طور پر کبھی کچھ کہہ لیا اور کسی موقعہ پر قافیہ پیمائی کر دی۔

مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی ڈاکٹر گل کرسٹ کے وطن واپس ہو جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے یہ فورٹ ولیم کے دوسرے دور کے اہل قلم میں ہیں انہوں نے کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایما سے رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ رسائل بصرہ کی ایک علمی انجمن موسوم بہ اخوان الصفا کی یادگار اور دس مختلف علم دوست آدمیوں کی تحقیقات اور موشگافیوں کا ماحصل ہیں ان رسائل کی جملہ تعداد اکاون بتائی جاتی ہے اور ان میں مختلف دلچسپ اور عجیب وغریب موضوعات پر عقلی اور نقلی بحثیں کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر ہے جس میں مخلوق میں افضلیت پر انسان اور حیوانوں میں شاہ اجنہ کے سامنے بڑے زور و شور کی بحث ہوتی ہے۔ ہر ایک فریق اپنی عقلی ونقلی دلائل سے اپنی فضیلت ثابت کرتا اور حریف سے بازی لیجانا چاہتا ہے بالآخر انسان کی افضلیت تسلیم کر لی جاتی ہے اور وجہ ترجیح یہ قرار دی جاتی ہے کہ انسان علوم ومعارف الہی سے آگاہ اور امانت الہی کا جس کو اٹھانے کی کسی مخلوق

نے حامی نہیں بھری، حامل پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسالوں میں ان تمام علوم و معارف الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوتا ہے تاکہ فضیلت انسانی کی حقیقت سے واقف ہو کر لوگ اس درجہ کمال کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنے میں وہ تمام اوصاف پیدا کریں جو حقیقی معنے میں انسان بننے کے لیے ضروری ہیں اور جن کے حصول کی مشکلات پیش نظر رکھ کر غالب نے فرمایا ہے ؏

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مولوی اکرام علی بہت ہی گمنام شخص ہیں ان کے حالات معاصرین نے بھی بیان نہیں کیے ہیں مولف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا ذکر تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ خود انہوں نے بھی اپنے متعلق بہت ہی کم لکھا ہے۔ جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ ان کے بھائی تراب علی اچھے عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے غالباً کلکتہ میں کمپنی کے ملازم اور کسی علم دوست انگریز کے میر منشی تھے۔ انہوں نے ان کو کلکتہ بلایا اور ایک انگریز مسٹر ایم لاکٹ کے توسط سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم رکھوایا۔ اس انگریز نے ان کو اپنے ہاں متعین کر لیا تھا کئی دن کے بعد فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر کپتان جان ولیم ٹیلر نے انہیں کالج میں منتقل کیا اور ان سے "اخوان الصفا" ۔

مرتب کرائی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے دیباچہ میں اپنا حال اور اپنی کتاب کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے۔

جب میں بموجب حسن ایماء جناب صاحب نامدار ....

خداوند نعمت ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے اور موافق طلب اخی واستادی جناب بھائی صاحب قبلہ مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا اور رہنموئی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا۔ از بسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی۔ سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا بعد چند روز کے باستصواب جناب عالی شان ... مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ، نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں، قلم انداز کر صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا چاہیئے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصل مطلب کو محاورہ اردو میں لکھا خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کی مناظرہ سے ان کو علاقہ نہ تھا کہ ترک کیں مگر بعضے خطبے اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔"

یہ رسالہ سنہ ۱۲۲۵ھ م سنہ ۱۸۰۱ء میں مرتب ہوا جیسا کہ مولف کے بیان سے ظاہر ہے "ترجمہ اس رسالہ کا خلاصہ امیران ذوالاقتدار .... نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ، کے عہد حکومت میں کہ سنہ ہجری بارہ سے پچیس اور عیسوی۔ اٹھارہ سے دس میں مرتب ہوا۔"

سر جارج ابراہم گیر یرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی جو تفصیل دی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک عرصۂ دراز تک مقبول خاص و عام رہی چنانچہ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سنہ ۱۸۱۱ء یعنی تالیف کے ایک سال بعد ہی شایع ہوا اس کے بعد سے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں سے اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ منشی سید حسین اور ٹی ایچ میانول نے اس کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے مگر آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں اردو کی دوسری قدیم کتابوں کی طرح ان دنوں یہ بھی خاص و عام کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور کوئی شخص اس کو مطالعہ کرتا نظر نہیں آتا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس کے دو نہایت قدیم مگر مطبوعہ نسخے محفوظ ہیں ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ بھی بہت قدیم اور بمبئی کے مطبع حیدری کا مطبوعہ سنہ ۱۲۸ھ ہے۔

مولف طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے کہ مولوی اکرام علی

شاعر بھی تھے۔ اور اکرام تخلص کرتے تھے مگر ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا۔ اسی تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخوان الصفا کا ترجمہ کرنے کے بعد بھی وہ کالج کے متوسل رہے اور ۱۸۱۲ء میں کالج کے محافظ کتب خانہ تھے۔ مولوی اکرام علی نے اس رسالہ کے علاوہ اور کوئی کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کی اور اخوان الصفا ہی ان کا واحد یادگار کارنامہ ہے۔

اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز بیان بالکل آسان اور عام فہم تھا انہوں نے اپنے افسر اعلی کے حکم سے مناظرہ جیسے دقیق مضمون کی کتاب کو بالکل سہل اور سلیس کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں سوا سو برس پہلے کے بعض مروجہ الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن عبارت تعقید سے بالکل پاک ہے جیسا کہ مولف نے دیباچہ میں بیان کر دیا ہے وہ تمام دقیق علمی اصطلاحات و خطبات کو خارج کر کے نفس مضمون کو سلیس اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں اور مناظرہ میں قصہ کہانی کا لطف پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ان کی خاص خوبی ہے اگر وہ اس کو اس قدر سلیس اور عام فہم نہ کرتے تو مولوی امانت اللہ کے ترجمہ اخلاق جلالی کی طرح یہ کتاب بھی طاق نسیان کی نذر ہو جاتی اور اس کو ہرگز وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی جو اس نے اپنی پہلی اشاعت کے ساتھ ہی پیدا کر لی تھی۔ میر بہادر علی حسینی

کی طرح ان کی زبان میں بھی محاورہ کی چاشنی نہیں مگر علمی مباحث اور عقلی دلائل میں جو سنجیدگی ہونی چاہیئے اس کا لحاظ کرتے ان کا طرزِ بیان کافی دلچسپ ہے ہندی اور عربی کے دقیق اور غیر مانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور باوجود عربی کے اچھے عالم ہونے کے ثقیل الفاظ سے اجتناب کر کے اُردو کے مروجہ الفاظ و تراکیب کو ترجیح دی ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے، سیدھی سادی زبان میں خیالات ظاہر کر دیے ہیں۔ اصل کتاب میں جہاں جہاں قرآنی آیات اور احادیث نبوی صلعم آئی ہیں ان کو اُردو اور عربی دونوں میں لکھ دیا ہے۔ ذیل میں تیسری فصل کا ایک اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ اس فصل میں صورتوں اور قدوں کے اختلاف پر معقول اور مدلل بحث کی ہے اور فریقین مباحث میں سے ہر ایک کی طرف سے ممکنہ دلیلیں وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں تاکہ نفس مضمون معقولیت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے۔

"اللہ تعالیٰ نے جس گھڑی انسانوں کو پیدا کیا عریان محض تھے بدن پر کچھ نہ تھا کہ سردی اور گرمی سے محافظت میں پھل پھلاری جنگل کے کھاتے اور درختوں کے پتوں سے تن کو ڈھانپتے اس واسطے ان کے قدوں کو سیدھا اور لمبا بنایا کہ درختوں کے پھل توڑ کر بہ آسانی کھاویں

اور اپنے تصرف میں لادیں اور عقا ہماری گھاس ہے اس لئے ہمارے قدوں کو بڑھا بنایا ہے کہ بخوبی چھوئیں اور کسی نوع کا دکھ نہ اٹھائیں۔ بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم یعنی انسان کو ہم نے نہایت سڈول بنایا ہے اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ اس نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کلام ربانی ہیں ظاہر المعنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا تفسیر اس کی عالموں سے پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک حکیم دانشمند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا۔ جس دن اللہ تعالےٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ سبھ گھڑی، نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شریف میں جلوہ گر اور ہیولےٰ عناصر کے واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ و مستعد تھے۔ اس لئے ایسی صورتیں اچھی، قد سیدھے، ہاتھ پاؤں درست بنے اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ فقد لک فی ای صورۃ ما شاء رکبک یعنی اللہ تعالےٰ نے انسان کو حد اعتدال پر پیدا کیا ہے۔ نہ بہت لمبا بنایا نہ چھوٹا بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت اعضاء کی واسطے فضیلت کے

کفایت کرتی ہے۔ حیوانوں نے عرض کی کہ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔ اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمہارے لیے مناسبت اعضا کی کہاں ہے۔ صورتیں بہت مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدے کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا۔ گردن لمبی، دُم چھوٹی اور ہاتھی ہے جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور بھاری دو دانت لمبے منہ سے باہر نکلے ہوئے کان چوڑے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ بیل اور بھینسے کی دم بڑی۔ سینگ موٹے، اوپر کے دانت نہیں۔ خرگوش کا قد چھوٹا۔ کان بڑے اس طرح بہت سے درند و چرند پرند ہیں کہ قد و قامت ان کا بے موقع، ایک عضو سے دوسرے کو کچھ مناسبت نہیں۔

نہال چند لاہوری

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سے نہال چند لاہوری بھی بہت مشہور ہیں مگر بعض اور منشیوں کی طرح ان کے حالات پر بھی گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منشی کریم الدین مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر نہیں تھے اور انہوں نے ایک آدھ شعر بھی نہیں کہا ان کے نام کے ساتھ لاہور کی نسبت ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے مگر ان کا مولد اور ان کے آبا و اجداد کا وطن شاہجہاں آباد دہلی تھا اور وہ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کے دیگر شرفا کی طرح ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور لاہور میں توطن اختیار کیا اور آگے چل کر لاہوری کہلائے۔

ایک انگریز کپتان ولورٹ نامی سے نہال چند لاہوری کے قدیم مراسم تھے اس کی سفارش اور وساطت سے وہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں باریاب ہوئے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم رکھ لیے گئے۔ نہال چند لاہوری کا صرف ایک ہی کارنامہ "مذہب عشق" ہے اور ان کی تمام نثر

بھی اسی ایک کتاب کی بدولت ہوئی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ترجمہ کی تھی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں اس کے ترجمہ اور کچھ اپنے احوال کے متعلق لکھتے ہیں۔

" اس کتاب کے ترجمہ کا یہ سبب ہے کہ مستمند نہال چند لاہوری کو اس نحیف کا مولد شاہجہاں آباد ہے۔ اشرف البلاد کلکتہ میں کہ بالفعل ہندوستان کا دارالعمارت ہے آب و خورش کھینچ کر لائی ہے اور یہ خاکسار کپتان ولورٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ ان کی دستگیری سے صاحب خداوند نعمت صاحب گل کرسٹ صاحب مدظلہ کے دامن دولت تک دسترس پایا۔ غرض کہ صاحب بہادر کے تفضلات سے بخوبی اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور امید زیادہ تر ہونے لگی کہ اگر بخت مددگار ہے اور یہ دامنِ دولت اپنے ہاتھ ہے تو حشمت قدم کے ساتھ ہے۔ پھر ایک روز خداوند نعمت نے ارشاد کیا کہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا قصہ فارسی میں ہے۔ ہندی ریختہ کے محاورہ میں ترجمہ کر کے تیری سرخروئی اور یادگاری کا موجب اور ہماری خوشنودی کا باعث ہو۔ چنانچہ اس نحیف نے حسب الارشاد فیض بنیاد اپنے حوصلہ کے موافق فلاطون فطنت مارکوئیس ولزلی نواب گورنر جنرل دام اقبالہ، کے عہد میں ہندی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔

یہ قصہ ابتداءً شیخ عزت اللہ بنگالی نے جو ۱۲۴ھ میں فوت ہوا ہے فارسی میں اپنے ایک عزیز دوست نذر محمد کے ایما سے تصنیف کیا ہے اور اس دوست کے قضا کر جانے پر بطور اس کی یادگار کے اس کو جو مسودہ کی صورت میں پڑا ہوا تھا صاف کیا اور اشاعت دی۔ یہ قصہ بظاہر کوئی قدیم قصہ نہیں ہے مگر قبول خاطر و لطف سخن خداداد است کچھ اس قدر جلد مشہور ہو گیا کہ شاید ہی ایسی کتابوں میں سے کسی اور کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہو۔ عام خاص لوگ اس کو قدیم مشہور کتابوں کی طرح دلچسپی سے پڑھنے لگے۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت محسوس کی اور نہال چند سے ترجمہ کرایا۔

"مذہب عشق" تاریخی نام ہے اور اس کے ترجمہ کا ۱۲۱۷ھ نکلتا ہے۔ اختتام کتاب پر مترجم نے ہجری اور عیسوی تاریخ کے حسب ذیل دو قطعات بھی دیے ہیں:-

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام	تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سنی میں نے آواز غیب	کہ ہے مذہب عشق تاریخ و نام
ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک و زباں	کریں عیسوی سال کو بھی بیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا	کہ اس مذہب عشق میں کوئی آ
کرے مشرب جام گر اختیار	تو راز نہال اس پہ ہو آشکار

مذہب عشق بہت مقبول ہوئی اور اب آپ قدیم قصہ

کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ ہمارے پاس جو نسخہ ہے وہ اب سے کوئی سات سال پیشتر کا چھپا ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی اس کے قدردان تھوڑے بہت موجود ہیں اس کی پہلی اشاعت ۱۸۱۴ء میں کلکتہ سے ہوئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن کے وقت میر شیر علی افسوس مؤلف "باغ اردو" نے اس کی نظر ثانی بھی کی تھی اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں اور بہت سے اصحاب نے اس کو اڈٹ کیا ہے۔ سر ابراہم گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی فہرست دی ہے جو نہایت طویل ہے۔

اس قصہ کی مقبولیت دیکھ پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد خواجہ حیدر علی آتش نے ۱۲۵۴ھ میں نہال چند لاہوری کے ترجمہ کو نظم کا جامہ پہنایا اور "گلزار نسیم" کے نام سے موسوم کیا۔ مثنوی گلزار نسیم کی تاریخ تصنیف خود نسیم کے اس تاریخی قطعہ میں ملتی ہے۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد توقیع قبول رونقش باد

ان کی یہ مثنوی بھی بے حد مقبول ہوئی اور اب بھی اردو کی مثنویوں میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

نہال چند کی "مذہب عشق" چھبیس ابواب پر مشتمل ہے اور

چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی طویل قصہ بیان کیا گیا ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا داستان بیان ہوئی ہے۔ اس لئے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" شیخ عزت اللہ بنگالی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے شیخ عزت اللہ نے ہندوستان کے فارسی اہل قلم اور اپنے معاصرین کی طرح پر تکلف عبارت لکھی ہے۔ ان کے زمانہ میں بلکہ اس سے ایک عرصۂ دراز پہلے سے فارسی نثر نویسی میں ہر قسم کی لفظی آرائشات و تکلفات داخل تھے اور کوئی بھی سلیس اور سادہ زبان لکھنا پسند نہیں کرتا تھا حتیٰ کہ اس زمانہ کے معمولی اور رنج کے خطوط بھی تکلفات لفظی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ ہر موقع پر انشاء پردازی کا کمال دکھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود شیخ عزت اللہ کو عبارت آرائی و لفاظی کا بے حد شوق تھا چنانچہ نہال چند نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس نے (شیخ عزت اللہ) سے اس کا سبب یوں لکھا ہے کہ طالب علمی کے ایام میں اس فقیر کو انشاء پردازی کے فن میں رغبت تمام تھی اور مسودے بھی کاغذ پر لکھ لکھ کر چھوڑتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیخ عزت اللہ کو انشاء پردازی اور پر تکلف عبارت لکھنے کی بڑی مشق اور شوق تھا اس لیے ان کا طرز بیان فارسی کے متاخر نثر نویسوں کی تمام خصوصیات سے معمور ہے۔ نہال چند نے

اپنے دیگر معاصرین کے برخلاف اُردو ترجمہ میں اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے ہیں اور نہ بہت کلام کے لئے جو تکرار لفظی ہوتی تھی اس کو بھی برقرار رکھا۔ ان کا ترجمہ اصل سے بہت کم ہٹنے پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز بیان ٹھیٹ اُردو کی کتابوں کی طرح سادہ اور سلیس نہیں۔ جابجا شاندار الفاظ اور فارسی کی ترکیبوں کے اُردو ترجمے پائے جاتے ہیں ترجمہ میں آزادی کو مطلق کام میں نہیں لایا گیا اور ساری کتاب پر فارسیت غالب ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں لیکن یہ جس زمانہ کی کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میر امن، شیر علی افسوس اور مظہر علی ولا وغیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس مقابلہ میں ان کی تحریر کو ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔

اکثر موقعوں پر قصّوں کے سلسلوں میں قطعات لکھے ہیں اور یہ غالباً انہی کے ہیں مگر ان میں بھی تکلف اور آورد ہے۔ سادگی و صفائی مطلق نہیں اس کے باوجود یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور عوام الناس نے خوب قدر کی۔ بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں ہمیشہ سے عجیب و غریب اور فوق العادت چیزوں سے رغبت رہی ہے اور ایسے ہی قصوں کو ان کی زبانی مشکلات کے باوجود لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا ہے اس

قصہ کا بھی یہی حال ہے۔ تاج الملوک اور بکاؤلی کا قصہ پہلے ہی بے حد مقبول تھا اور جب اس کو اُردو میں بیان کیا گیا تو پھر لوگوں نے شوق سے خریدنا شروع کیا اور اس کو متعدد بار چھاپنے کی ضرورت پڑی مذہب عشق کا ایک نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو۔

"جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاؤلی چھین لیا اور وہ بیچارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا مثل ہے کہ "قہر درویش بجان درویش" پھر کج فہموں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیوؤں سمیت آ پہنچی۔ اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی کہ اے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنایا۔ تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے۔ اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے حمالہ نے کہا کہ اے عیار باتیں نہ بنا وہ کون کام ہے جلدی کہہ۔ تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہو بہو بکاؤلی کے قصر اور

باغ سا ہو، بناؤ۔ تم جس طرح جانو جلد بنوا دو۔ وہ بولی اے بیٹا یہ کتنی بڑی بات ہے مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو دیکھا نہیں بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوا دوں۔ تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنوا دو۔ حمالہ نے اسی وقت کئی سو دیو لعل بدخشانی کے اور سینکڑوں عقیق یمانی کے لئے اور ہزاروں روپے اور جواہر بیش قیمت کے واسطے ہر چہار طرف بھیجے دیوؤں نے تین روز کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ کے جا بجا تو دے لگا دیے پھر شہزادہ جس طرح بتانے لگا اسی طرح وہ بنانے لگے پہلے تو دو دو نیزے مٹی کھود کر پھینکدی اور وہاں زر خالص بھر دیا اور اس قطعہ طلائی پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض تھوڑے دنوں میں ویسا ہی قصر اور اس طرح کا باغ جواہر نگار جڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبرجد اور یاقوت کے دو دالان عالیشان آمنے سامنے بیچ میں ان کے ایک حوض مرصع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا پھر ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جواہر سونا روپیہ دیو لائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کارخانہ جات کی تیاری کو دیدیا

اور باقی خزانہ میں داخل کیا"۔ (مذہب عشق مطبوعہ لکھنؤ ص۳۳)

اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب "مذہب عشق" کی کما حقہ قدر نہیں کی جاتی ہے کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی ایسی خاص دل کشی ہے کہ اُردو بولنے والے ہمیشہ اس کے گردیدہ بنے رہیں اور نہ مذہب عشق ہی کا قصہ اس زمانہ میں لوگوں کی ضیافت طبع کا کچھ سامان بہم پہنچا سکتا ہے۔ اب اُردو نے ترقی کے اتنے مدارج طے کر لیے ہیں اور اس میں لٹریچر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ مذہب عشق اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم نے اُردو نثر کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اُردو نثر نویسی کے ابتدائی اور دشوار گزار مراحل کو جن محنتوں سے طے کر کے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا ہے وہ ایسی نہیں کہ اُردو بولنے والی نسلیں ان کو بھلا دیں۔ ہمارے ان پیشرو ان نثر میں نہال چند بھی ہیں اور اس لحاظ سے توجہ اور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ ان کی قدامت ہی ان کی زندگی اور کارنامے کو اہمیت دیتی ہے۔

منشی بینی نارائن جہاںؔ

فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم میں منشی بینی نارائن المتخلص بہ جہاں نہایت غیر معروف مولف ہیں بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف ہیں ان کے کارنامے یقیناً قابل قدر ہیں مگر بدقسمتی سے اس وقت تک ایک کو بھی طباعت و اشاعت نصیب نہ ہو سکی۔ جہاں کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھے اس لیے کسی تذکرے اور تاریخ میں ان کا ذکر نہیں البتہ منشی کریم الدین مولف طبقات الشعرائے ہند نے اپنے تذکرے میں سرسری طور پر چند سطریں لکھدی ہیں جو موجودہ حالت میں بہت غنیمت ہیں۔

بینی نارائن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے کھم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے ان کا تخلص رندؔ تھا۔ بینی نارائن نے اپنی کتابوں کے دیباچہ وغیرہ میں اپنا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے۔ ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ گردش زمانہ سے وہ بہت تباہ حال اور تنگدست ہو گئے

اور چند ہی روز میں آسمانی سلطانی آفتوں نے امارت و تموّل سے محروم کر کے تلاش معاش کے لیے آوارہ وطن کر دیا۔ پے در پے پریشانیاں اٹھا کر بالآخر وطن کو خدا حافظ کہا اور آب و دانہ کی تلاش میں کئی سال ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ جا پہنچے۔ ان کے کلکتہ آنے کا باعث فورٹ ولیم کالج کے قیام اور وہاں اہل قلم کی قدر دانی و پرورش کی خبریں تھیں۔ جس وقت یہ کلکتہ پہنچے فورٹ ولیم کالج کا دورِ اول گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو اس کالج کے روح رواں اور مولفوں کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ اس کی صدارت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کو واپس ہو چکے تھے۔ کمپنی کے اربابِ حل وعقد نے کالج کے دائرہ عمل کو محدود کرنا شروع کر دیا تھا اور وہاں نئے اہل قلم کی سرپرستی و اعانت کا کوئی سامان نہ تھا یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن کلکتہ پہنچتے ہی کوئی عمدہ خدمت حاصل نہ کر سکے اور ان کو نووارد سمجھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ غرض یہاں بھی بارہ برس کا زمانہ دراز عسرت و پریشانی میں بسر ہوا اس عرصہ میں انہوں نے کالج کے مشہور اربابِ قلم اور مولفین سے راہ و رسم پیدا کر لی اور خصوصاً سید حیدر بخش حیدری سے ان کا ربط ضبط بڑھ گیا ان ہی کی سفارش سے بینی نارائن کو کپتان ٹامس روبک کے ہاں باریابی کا موقع ملا۔ کپتان مذکور نے ان کو کالج کے ارباب قلم

میں ملازم رکھ لیا اور تصنیف و تالیف کا کام لینے لگے۔

کالج کی سلک ملازمت میں داخل ہو کر بینی نارائن نے دو کتابیں تالیف کی ہیں (۱) "چار گلشن" اور (۲) "دیوان جہاں" گارساں دی تاسی نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کے علاوہ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کی فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا بھی ۱۲۳۴ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے۔ گارساں دی تاسی ہی کا بیان ہے کہ بینی نارائن نے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور مشہور مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ہاتھ بیعت کی تھی اس بیان میں شک و شبہہ کی گنجایش نہیں بینی نارائن کا ترجمہ تنبیہ الغافلین موجود ہے جس سے یہ بیان بالکل مصدقہ ہو جاتا ہے ان کی تاریخ وفات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔ البتہ گارساں دی تاسی کے مذکورۂ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۳۵ھ کے بعد وفات پائی ہو گی۔

بینی نارائن کی کتابوں کو افسوس ہے کہ طباعت و اشاعت کا موقع ہی نہیں ملا اور اب تک وہ مسودہ کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں خوش قسمتی سے یہ مسودے اب نہایت ہی حفاظت میں ہیں ورنہ ایسی چیزوں کا جن کو شائع ہونے کا موقع ہی نہ ملا ہو دست برد زمانہ سے بچ رہنا بہت مشکل ہے۔ ان کی مولفات میں سب سے زیادہ اہم چیز "تذکرۂ دیوان جہاں"

ہے اور اس وقت اس کی اشاعت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے اکثر معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے جو شاعری کی وجہ سے بہت ممتاز ہیں اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ان کی طرف سے بالکل بے اعتنائی برتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر یہ تذکرہ شائع ہو جائے تو اس سے اُردو نثر نویسی کے پیش رووں کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

چار گلشن یہ بینی نارائن کی سب سے پہلی تالیف ہے یہ ایک عشقیہ قصہ ہے اور اس میں شاہ کیوان اور فرخندہ کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس قصہ کا پلاٹ ایک زمانۂ دراز سے اس کے ذہن میں تھا۔ ایک مرتبہ ۱۲۲۵ھ م ۱۸۱۱ء میں انہوں نے یہ قصہ مولوی امام بخش کو سنایا تو انہوں نے بے حد پسند کیا اور اس کو سلیس نثر میں لکھنے پر زور دیا ان کے ایماواصرار سے یہ قصہ لکھا گیا اور کالج کے انگریز عہدہ دار کپتان ٹامس روبک اور کپتان ولیم ٹیلر کو دکھایا گیا تو انہوں نے پسندیدگی ظاہر کی اور مؤلف کو کافی صلہ دے کر اس سے مسودہ حاصل کر لیا۔ یہ کالج کے کتب خانہ میں رکھا گیا۔ یہ قصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد فارسی زبان کے کسی قدیم قصہ پر رکھی گئی ہے گارسان دی تاسی

نے اس کو ہلالی کے قصہ "شاہ و درویش" کا ترجمہ بتایا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ ہلالی کا قصہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ مولف نے اس کا نام حسب ذیل میں نظم کر دیا ہے۔

رکھا چار گلشن جو میں اس کا نام رہیگی خزاں دور اس سے مدام

یہ قصہ اب تک شایع نہیں ہوا۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو غالباً کتب خانہ فورٹ ولیم کالج ہی کا ہے بینی نارائن کی تالیف بہ حیثیت قصہ نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک قدیم نثری کتاب ہونے کے ضرور قابل قدر ہے، باغ و بہار، باغ اردو، آرائش محفل کی طرح یہ بھی اردو کی ابتدائی کتب نثر میں ہے اور تاریخ ادبیات اردو میں اس سلسلہ کی ایک کڑی ہونے کی وجہ سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ ہے وہ نہایت خوشخط اور صحت و احتیاط سے رقم ہوا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو ہمارے عنایت فرما ڈاکٹر زور صاحب نے نقل کر کے بھیجا ہے۔

زمانہ گذشتہ کے نقل کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتہ بیان اس طرح منسلک کیا ہے۔ کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ

نہایت عالیشان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے شان وشوکت اور جاہ وحشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب ورعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔ بہت فلک مرتبت تھا۔ وہ کیوان شاہ رو مشعل فروز اس کے تھے مہرو ماہ۔ ایک دن وہ بادشاہ قلعہ کے جھروکے میں بیٹھا ہوا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ بہت آدمی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو رہے تھے گزارے کی کشتیاں آدمیوں سے بھری ہوئیں اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر آتی جاتی تھیں۔ (چار گلشن قلمی ص۱۲)

دیوانِ جہاں بینی نرائن کی دوسری اور مفید تالیف تذکرۂ "دیوان جہاں" ہے یہ کپتان رویک کے ایما سے لکھا گیا ہے اور کالج کی طرف سے تیسرا تذکرہ ہے۔ اس سے قبل کالج کے دو اہل قلم مرزا علی لطف اور سید حیدر بخش حیدری شعرائے اُردو کے تذکرے لکھ چکے تھے ان میں سے لطف کا تذکرہ تو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے لکھا گیا اور حیدری نے اپنے طور پر مرتب کیا۔ حسن اتفاق سے ان دونوں کے نام "گلشن ہند" ہیں۔ حیدری کا گلشن ہند کسی قدر ناقص اور مسودہ کی صورت میں پڑا رہا۔ اور لطف کا تذکرہ حسن اتفاق سے شائع ہو گیا مگر

اس میں صرف مشاہیر شعرا کا ذکر ہے اور غیر معروف شاعروں کو جگہ نہیں دی گئی ان کے لیے وہ دوسری جلد لکھنے والے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ اس کی تکمیل کر سکے یا نہیں۔ یورپ اور حیدرآباد میں لطف کے "گلشن ہند" کے قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی دوسری جلد شامل نہیں ہے ممکن ہے کہ غیر معروف شعرا کے متعلق کچھ لکھنے نہ پائے ہوں۔ علاوہ انہیں ان کا طرز بیان اس قدر پیچیدہ اور پر تکلف ہے کہ عوام الناس اور وہ نو وارد انگریز جنھیں اردو میں نوشت و خواند کی تھوڑی سی صلاحیت ہوتی تھی اور جن کے لیے یہ تذکرہ تالیف کرایا گیا تھا اس سے کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتے تھے غالبًا اسی لیے یہ تذکرہ کالج کی طرف سے شائع نہیں کیا گیا اور کپتان روبک نے ایک اور تذکرہ کی ضرورت محسوس کر کے جہاں سے لکھوایا۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کی تاریخ تالیف سنہ ۱۲۲۷ھ م ۱۸۱۲ء بتائی ہے مگر خود مؤلف تذکرہ نے اس کی تاریخ اختتام سنہ ۱۲۲۹ھ م ۱۸۱۴ء لکھی ہے۔ غالبًا اس کی تالیف سنہ ۱۲۲۷ھ میں شروع ہوئی اور دو سال میں اختتام کو پہنچی۔ اس تذکرہ میں (۱۲۵) شعرا کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے قدیم تذکروں کی طرح اس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی گئی ہے۔ شعرا کے حالات میں اکثر صرف نام، ولدیت، سکونت و تلمذ وغیرہ پر اکتفا کیا ہے اور تاریخ ولادت و وفات اور

دیگر ضروری امور نہیں بیان کیے گئے۔ یہ بات اُردو کے تقریباً تمام قدیم تذکروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے حالات فراہم کرنے میں بالکل بے توجہی سے کام لیا ہے۔ دیگر تذکروں کی طرح اس میں بھی ہر شاعر کے ذکر کے ساتھ اس کا تھوڑا سا کلام بطور نمونہ نقل کر دیا گیا ہے مولف نے اس میں اپنا بہت سا کلام شریک کر دیا ہے اور کتاب کے آخر میں اپنی رباعیوں مطلعوں اور ادبیات کا مجموعہ بھی داخل کر کے اس کا حجم بڑھا دیا ہے۔ گویا یہ ان کا دیوان بھی ہے اور شعرائے اُردو کا تذکرہ بھی، اور غالباً اسی مناسبت سے اس کا نام "دیوان جہاں" رکھا گیا ہے۔ اس کا دیباچہ بھی نظم میں ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نایاب چیز ہے۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے اور غالباً یہی نسخہ محفوظ ہے ہمیں اپنے دوست ڈاکٹر زورؔ صاحب کی عنایت سے ایک نقل حاصل ہوئی ہے۔ چند شاعروں کا ذکر نمونتاً درج کیا جاتا ہے:۔

ولی تخلص نام مرزا محمد ولی معروف آگاہ شاہ اسرار اللہ کے بھتیجے دکن کے رہنے والے۔ یہ ان سے ہے۔

اس قدر سرجس چمن میں وہ نونہال ہوگا کیا سرو کیا صنوبر ہر اک نہال ہوگا

ولا تخلص نام مرزا لطف علی عرف مظہر علی خاں خلف سلیمان خاں عرف مرزا احمد زماں خاں و داد ابن محمد حسین مخاطب

علی قلی خاں دلیؔ کے رہنے والے ہمیشہ عمدہ روزگار رہے بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور اس خاکسار پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں۔

افسوس تخلص نام میر شیر علی میر علی مظفر خاں کے بیٹے پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح کی۔ بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیراںؔ کے۔ نارنول کے رہنے والے کلکتہ میں آن کر رحلت کی۔

محبت تخلص۔ نام نواب محبت خاں، نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے اس نحیف پر نہایت مہربانی فرماتے تھے اور ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ میں تشریف لاتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج میں تالیف و تراجم کے سلسلہ میں اہل قلم اور شاعروں کی جو جماعت یکجا ہوئی اس نے اپنے ادبی ذوق اور شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے کلکتہ میں ایک مشاعرہ کی بنا ڈالی یہ مشاعرہ ہر سال نہایت اہتمام کے ساتھ ۲۵ ر جولائی کو منعقد ہوتا تھا۔ اس میں وہاں کے تمام چھوٹے بڑے شاعر ہم طرحی ... غزلیں سناتے تھے۔ اُردو کے محسن اور دلدادہ انگریز بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے اور ان کی نگرانی میں یہ مشاعرہ ایک باضابطہ شاعرانہ مقابلہ اور علمی دنگل ہو گیا تھا۔ برٹش میوزیم

میں دیوان جہاں کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے اس کے آخر میں ایک گلدستہ غالباً ۲۵ جولائی ۱۸۱۵ء کے مشاعرہ کا ہے۔ اس میں مندرجۂ ذیل شعراء کی غزلیں ہیں ان میں سے بعض تو فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلکتہ کے پیشہ ور شاعر تھے۔

۱۔ جوآن ۔ مرزا کاظم علی دہلوی	۲۔ حیدری ۔ سید حیدر بخش دہلوی
۳۔ شہرت ۔ افتخار الدین علی خاں	۴۔ رواں ۔ سید جعفر علی لکھنوی
۵۔ عیاں ۔ مرزا ہاشم علی پسر خورد جوان	۶۔ قاسم ۔ ابوالقاسم خاں دہلوی
۷۔ ممتاز ۔ مرزا قاسم علی پسر کلاں	۸۔ ولا ۔ مظہر علی دہلوی

تنبیہ الغافلین

بینی نارائن کا تیسرا کارنامہ "تنبیہ الغافلین" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ خلف الرشید مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی ایک فارسی تالیف ہے اردو کے لحاظ سے آپ کی متعدد تالیفوں میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ نہایت اہم کتاب ہے۔ شمالی ہند میں سب سے پہلے آپ نے ہی اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا ہے آپ نے کتاب تنبیہ الغافلین مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ایما سے عامۃ المسلمین کے فایدہ کے لیے سلیس فارسی میں تالیف فرمائی تھی یہی مولوی سید احمد صاحب بینی نارائن کے پیرو مرشد تھے۔

بینی نارائن کا ترجمہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ۱۲۴۵ھ میں تمام ہوا اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے یہ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے بعد ترجمہ ہی کی شہرت ہوئی ہوگی۔ مگر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ طبع بھی ہوا یا نہیں، آج کل تنبیہ الغافلین اردو کے جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں وہ یقیناً بینی نارائن کے نہیں ہیں۔ بینی نارائن کے ترجمہ میں صرف (۲۰) ابواب ہیں اور موجودہ نسخوں میں (۵۲) ابواب پائے جاتے ہیں مطبوعہ ترجمہ سید محمود محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی متحدہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز اور مولوی امیر الدین کی تصحیح سے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی بینی نارائن کے ترجمہ کرنے کا ذکر نہیں البتہ یہ فقرہ موجود ہے "اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو جس میں (۲۰) باب تھے فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں" معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بینی نارائن ہی کا ہے آیتوں اور حدیثوں سے غلطیاں رہ جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ نیز اس ترجمہ کو ہندی زبان میں بتانا بھی یہ امر ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد انہی کا ترجمہ ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم

اور اس زمانہ کے اکثر مصنفوں کی کتابوں میں اُردو کی جگہ ہندی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور کہیں بھی اُردو کا لفظ نہیں لکھا گیا۔ علاوہ ازیں بینی نارائن ہی کا ترجمہ (۲۰) ابواب پر مشتمل ہے۔ ذیل میں تنبیہ الغافلین کا نمونہ عبارت دیا جاتا ہے جو مکرمی زور صاحب کی عنایت سے انڈیا آفس کے نسخہ سے ہمدست ہوا ہے۔

بنی اسرائیل مے ایک جگہ تین بھائی تھے ان میں ایک بڑا دانا تھا اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجالائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملیگی تم دونوں ہی بانٹ لیجو۔ یہ بات سن کے وہ بہت خوش ہوے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گزران کرنے لگے بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں اس کی رنڈی یہ بات سن کے فضیحت کرنے لگی۔ ایک رات اس بچارے نے خواب میں

دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے فلانی جگہ سو دینار۔
سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے اس نے اعتبار
نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پھر خواب میں دیکھا کیا
بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔

(تنبیہ الغافلین قلمی ص ۲۲۴)

میر عبداللہ مسکینؔ

فورٹ ولیم کالج کے بالکل غیر معروف بلکہ گمنام منشیوں میں ایک میر عبداللہ مسکینؔ بھی ہیں۔ مرزا رفیع سوداؔ نے اپنے مشہور "شہر آشوب" میں جہاں شعراء کی بری حالت کا نقشہ کھینچا ہے ایک شعر یہ لکھا ہے۔

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا　　پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہیں

میاں مسکین کے متعلق مختلف حضرات نے مختلف قیاسات قایم کیے ہیں علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" میں مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "یہ معلوم نہیں کہ (اردو میں) مرثیہ کی ابتدا کس نے کی اس قدر یقینی ہے کہ سوداؔ اور میرؔ سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا سوداؔ نے اپنے "شہر آشوب" میں میاں مسکینؔ مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے۔[۱]"

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ خود سوداؔ نے مرثیوں میں اپنا تخلص مسکینؔ رکھا ہے مگر

---

[۱] موازنہ انیس و دبیر مطبوعہ انوار احمدی پریس ص ۳۳

ہمارا خیال ہے کہ سودا کے پیش نظر یہی مسکین میر عبد اللہ نامی تھے ذیل میں ان کا جو حال بیان کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ میر عبد اللہ مسکین مرزا صاحب کے معاصر تھے اور اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ ابھی میر انیس اور مرزا دبیر نے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر اپنی شیوہ بیانیوں اور جدت طرازیوں سے اس خیال کو باطل نہیں ٹھہرایا تھا۔ مرثیہ اردو شاعری کی نہایت حقیر اور بے وقعت صنف تھی۔ میر تقی نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اگرچہ مرزا سودا نے اپنی ہمہ گیری اور جامعیت کی وجہ سے مرثیوں کا بھی ایک اچھا خاصہ دیوان یادگار چھوڑا ہے مگر وہ بھی اس زمانہ میں اور ایک عرصہ بعد بھی کسی رقم التفات سے محروم رہا اور اس میدان میں مرزا کی جولانی طبع کو خاطر خواہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

مرثیہ گوئی کی بے وقعتی ہی غالباً اس کا سبب ہے کہ ریختہ گویوں کے اکثر و بیشتر بلکہ تقریباً تمام تذکرے بیچارہ مسکین کے ذکر سے خالی ہیں۔ کسی صاحب تذکرہ نے اس غریب مرثیہ گو شاعر کو اپنے تذکرہ میں بیان کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔ منشی کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند[1] میں جہاں اور بہت

---

[1] طبقات الشعرائے ہند ص ۲۱۷ ۱۲

سے غیر معروف اور گمنام شاعروں بلکہ موزوں طبع لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ مسکینؔ کو بھی شریک کتاب کر لیا۔ اس کی وجہ بھی ڈاکٹر فیالن کی توجہ ہے اگر ڈاکٹر فیالن ان کا ذکر نہ کرتے تو یقینی تھا کہ کریم الدین بھی ان کو فراموش کرتے کریم الدین کا بیان بھی اس قدر مختصر ہے کہ ان کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکتا۔

ان کے حالات زندگی کی تلاش میں تذکروں کے علاوہ دیگر آزاد ذرائع سے رجوع کیا گیا مگر ان کے وطن، مولد و منشار، تاریخ ولادت و وفات وغیرہ کا پتہ نہیں ملا انہوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانہ صدارت میں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت اختیار کی اور ان کے انگلستان چلے جانے کے ایک عرصہ بعد بھی وہیں ملازم اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اردو نثر میں ان کا کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ موجودہ معلومات سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مشہور اور عام طور پر مقبول مرثیہ گو تھے۔

جیسا کہ ہم نے آگے اس کا ذکر کیا ہے گریرسن[1] کا بیان ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی "بیاض ہندی" کی تالیف میں مسکینؔ ان کے شریک کار تھے۔ یہ کتاب زیادہ تر کالج کے ارباب قلم کی تصانیف و تراجم کے انتخابات پر مشتمل ہے اس کی تدوین و انتخاب میں مسکینؔ نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں

---

[1] لنگ وسٹک سروے آف انڈیا (گریرسن) ص ۱۷

ان کا بھی کوئی مضمون یا نثری قطعہ عبارت شریک ہو۔ اس کتاب کا ایک ہی ایڈیشن شایع ہوا تھا دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ہماری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری اور نہ کہیں اس کا موجود ہونا معلوم ہوا

میر عبداللہ مسکینؔ نے زیادہ تر مرثیے ہی کہے ہیں دیگر اصناف سخن میں ان کا کلام بالکل کم ہے۔ یوں تو وہ مشہور مرثیہ گو ہیں اور ان کے مرثیے عوام میں بہت مقبول اور رائج تھے مگر ایک طویل مرثیہ جو حضرت مسلمؓ بن عقیلؓ اور آپ کے صاحبزادوں کی شہادت پر لکھا گیا تھا بے حد مقبول ہوا۔ علاوہ اردو میں شایع ہونے کے دیوناگری رسم الخط میں بھی اس کا ایک ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں نکلا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا جس طرح میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نثر بے نظیر کے نام سے اردو نثر میں لکھا تھا۔ اس مرثیے کے مضمون کو بھی نثر میں بیان کیا گیا ہے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کو نثر کا لباس کس نے پہنایا خود مسکین نے اس کی نثر کی یا کسی دوسرے معاصر اہل قلم نے اس مقبولیت عام کے مد نظر اس کو نثر میں لکھ دیا۔

مسکین کے مراثی کا ایک اچھا خاصا دیوان ترتیب پایا تھا اسپرنگر نے کتب خانہ شاہان اودھ میں اس کا ایک نسخہ ہونا بتایا ہے۔ اس کا نام مجموعہ مرثیہ ہائے مسکین لکھا ہے اس ایک نسخہ کے علاوہ کہیں اور مسکین کا مجموعہ مراثی نہیں پایا جاتا۔

اُردو کے مشہور فرانسیسی پرستار، گارساں دی تاسی نے جو ہندوستان سے کوسوں دور رہنے کے باوجود اپنے عہد کی ہر ایک اُردو تحریر اور تصنیف و تالیف سے باخبر رہتے تھے۔ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ ۱۸۴۶ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔

طبقات الشعرائے ہند میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی قواعد اُردو میں مسکینؔ کے کلام سے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں غالباً اصطلاحات صرف و نحو کی مثالوں میں زیادہ تر ان کے عام پسند اشعار کو نقل کر لیا گیا ہے۔ طبقات الشعرائے ہند میں ان کے کلام کا نمونہ نہیں ہے مگر، بہت مشہور شاعر بتایا گیا ہے۔

للّولال کوی

سری للولال ہندی زبان کے مشہور عالم اور شاعر ہیں یہ بھی ڈاکٹر گل کرسٹ کے زمانۂ صدارت میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم اور ہندی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی خدمت پر مامور تھے۔ فورٹ ولیم کالج کی مساعی اردو نثر سے ان کا تعلق اگرچہ براہ راست کچھ نہیں رہا۔ اور ان کی تالیفات تقریباً تمام برج بھاشا میں ہیں۔ لیکن وہ کالج کے دوسرے منشیوں کو ہندی کتابوں کے ترجمہ کرنے میں بڑی مدد دیتے رہے اور کالج کی سرپرستی میں بعض عمدہ ہندی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ علاوہ ازیں ان کی ہندی تحریر بھی نہایت صاف و شستہ تھی۔ اگر اس کو فارسی رسم الخط میں لکھا جائے تو اس کو تحریر ہی کہا جائے گا اس میں سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کی بے جا بھرمار نہیں ہے۔

للولال کا خاندان ابتداءً گجرات میں آباد تھا لیکن وہ گجرات سے ترک وطن کر کے ایک مدت سے شمالی ہند میں آبسے تھے ان کے حالات زندگی بالکل پردۂ تاریکی میں ہیں صرف اس

قدر معلوم ہے کہ وہ ذات کے برہمن تھے اور بچپن ہی سے شمالی ہند میں بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے برج بھاشا سنسکرت اور دیگر پراکرت زبانوں پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔

ہندی ادبیات میں للو لال کی تالیفات خاص طور پر اہم اور عہد آفریں سمجھی جاتی ہیں وہ معیاری یا اعلیٰ و فصیح ہندی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں[1] ان کے ساتھ ایک اور ہندی زبان کے ماہر سدل مصرا بھی فورٹ ولیم کالج میں تھے ان دونوں نے ہندی زبان میں نثر نویسی کا میدان صاف کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعہ زبان و طرز بیان کا ایسا پسندیدہ نمونہ پیش کیا کہ متاخر ہندی اہل قلم نے اسی پر اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی ان دونوں نے اس زمانہ کے عام اردو مولفین کے برخلاف اردو و تحریر سے عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے زیادہ سلیس اور عام فہم الفاظ داخل کیے اور اپنی کتاب دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر ہندی نثر نویسی کے اعلیٰ نمونے قوم کے آگے پیش کیے ان کی مساعی جیسا کہ ہندی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں نہایت کامیاب ہیں ہندی نثر نویسی میں ان کو مجدد اور مخترع کا درجہ حاصل ہے۔ سدل مصرا للو لال کے ادبی مددگار اور رفیق

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی از ایف۔ ای۔ کئی ص ۸۸

ایک ہندی قصہ کے مولف ہیں البتہ للولال کی تالیفات زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں۔ ذیل میں ان کی مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

پریم ساگر یہ بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ برج بھاشا میں اس کو ایک اور پنڈت چتربھوج مصر نے بھی لکھا ہے للولال نے اس نسخہ سے ثقیل سنسکرت الفاظ اور غیر مانوس قدیم ترکیبیں خارج کر کے از سر نو ایک کتاب مرتب کی پریم ساگر میں ہندوؤں کے مشہور دیوتا سری کرشن جی کی روائی تاریخ اور دیگر حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے ایڈیشن ۱۸۰۴ء، ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۵ء میں شائع ہوئے۔ للولال کی یہ کتاب بہت مقبول رہی۔ ہندوستان اور یورپ کے ہندی داں طبقہ نے اس کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا انگریزی میں بھی اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں ایک کپتان ولیم ہولنگس نے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شائع کیا اور دوسرا ایڈورڈ ایسٹ وک نے لندن سے ۱۸۶۷ء میں۔

راج نیتی للولال کی تالیفات میں یہ کتاب بھی خوب مشہور ہوئی۔ اس میں قصص و حکایات کے پیرایہ میں ہندوؤں کے اصول اخلاقیات اور فوجی و غیر فوجی پالیسی اور طرز حکومت وغیرہ مختلف امور پر بحث کی گئی ہے پریم ساگر کی طرح اس کی زبان

بھی نہایت فصیح ہندی ہے۔ یہ کتاب ابتداءً سنسکرت میں نارایَن پنڈت نے لکھی تھی۔ راج نیتی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۹ء میں کلکتہ سے شایع ہوا بعد میں متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔ ایک عرصہ تک یہ کتاب ہندی کے نصاب میں داخل تھی۔

سبھا بلاس یہ ہندی کی چیدہ اور دل کش نظموں کا مجموعہ ہے جو کالج کے طلبائے ہندی کے لیے بطور انتخاب نظم مرتب کیا گیا تھا۔ ہندی دوہے اور گیت عوام میں جس پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اس کی وجہ سے یہ مجموعہ خوب مشہور ہوا اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں شایع ہوا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں کالج کے ایک انگریز پروفیسر کپتان ایم پرائس نے ایک اور ایڈیشن چھاپا تھا۔ گلبرٹ سن نے ۱۹۱۰ء میں بنارس سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع کیا۔

مہادیو بلاس یہ ایک منظوم افسانہ عشق و محبت ہے اس میں مہادیو اور سلوچن کے عشق و عاشقی کے حالات نظم کیے گئے ہیں یہ افسانہ سنسکرت میں تھا للولال نے برج بھاشا میں نظم کر دیا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا پہلا ایڈیشن کب نکلا۔ آگرہ سے ایک ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا تھا ازاں بعد متعدد ہندی مطبعوں میں یہ نظم چھپی اور اس کا بھی بہت چرچا رہا۔

لطائف ہندی یہ ہندوستانی لطائف اور ظریفانہ کہانیوں کا مجموعہ ہے ابتداءً فارسی اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ اس میں متعدد بر محل امثال، ضلع جگت، ریختہ اور برج بھاشا کے صنائع اور لفظی تکلفات ہیں اس میں اردو انگریزی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اس کا آدھا حصہ جو ہندی سے متعلق ہے للو لال کا کارنامہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے ایک اور ایڈیشن ولیم کارمیکل اسمتھ نے شائع کیا تھا۔ اس میں سے ناگری رسم الخط کا حصہ خارج کر دیا گیا۔

سنگاسن بتیسی پریم ساگر اور راج نیتی کی طرح للولال کا ایک مشہور کارنامہ "سنگاسن بتیسی" بھی ہے اس کی بنیاد بھی سنسکرت کے کسی قدیم قصہ پر رکھی گئی ہے للولال نے ہندی میں اس کا بہ تغیر الفاظ و تراکیب صاف ترجمہ کر کے دیوناگری خط میں شائع کرایا تھا اس کی مقبولیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ اردو رسم الخط میں بھی یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اردو رسم الخط کا ایک نسخہ ہمیں ملا ہے اس سے ایک چھوٹی سی حکایت نقل کی جاتی ہے یہ اصل ہندی عبارت ہے صرف رسم الخط بدل دیا گیا ہے اس میں اگرچہ ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور فارسی و عربی کے لفظ بہت کم نظر آتے ہیں تاہم یہ اتنی مشکل

نہیں کہ اُردو داں حضرات اس سے بالکل لطف اندوز نہ ہو سکیں اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے بیجا تعصب قومی سے دور رہ کر ثقیل و نامانوس الفاظ عربی فارسی اور سنسکرت کے استعمال نہ کریں اور زبان کی قدرتی ساخت اور رفتار کے موافق ہندی اور فارسی کے سلیس الفاظ پر تحریر کا انحصار رکھا جائے تو یقیناً اُردو سارے ہندوستان کی مقبول عام زبان بن جائے گی اور اُردو ہندی کا وہ بڑا جھگڑا مٹ جائیگا جو ہندو مسلمانوں میں اجنبیت پیدا کرانے کا موجب اور ان کے سیاسی اتحاد کی راہ میں بھی بری طرح حائل ہے۔

ایک روز ایک پنڈت کہیں راجہ بکرماجیت کے پاس آیا اور اس نے آن کر بیان کیا کہ جو کوئی محل بنانے کی بنا موافق میرے کہنے کے دھرے بہت چین اٹھاوے اور بڑا انام پاوے راجہ نے کہا اچھا ظاہر کر برہمن کہنے لگا جب تلا لگن آوے جو اس میں سندر اٹھاوے جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے اور جب تلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دے۔ اسی طرح تلا لگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لا دے اس کا آلوٹ بھنڈارہ ہو اور لچھمی اس کے یہاں سے کبھی نہ جاوے یہ بات سن کر راجہ من میں خوش ہوا دیوان کو بلایا اور مندر اٹھانے کی

اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تلالگن بھی آن پہنچی اس مندر کی بنوٹ ویسی دیسی ہیں یہ ادا ہوئی کہ راجہ تلالگن میں محل بنواتا ہے جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے وے اٹھ کر تلالگن میں بنانے لگے۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا چنانچہ دریا کے کنارے پر وہ حویلی بنائی۔ چار دروازے اور سات کھنڈ اس میں رکھے جگہ جگہ جواہر انمول اس میں جڑے اور دروازہ پر دو نیلم کے بڑے بڑے نگینے لگائے جو کسی کی نظر نہ لگے۔ وہ جڑاؤ محل کتنے برسوں میں ایسا تیار ہوا کہ دنیا کے پردے پر کسی نے دوسرا آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا تب دیوان نے جاکر راجہ کو خبر دی کہ مہاراج وہ مندر اب تیار ہوا آپ چل کر اسے دیکھئے۔ راجہ نے ملاحظہ کیا تب برہمن دیکھ کر اور ہنس کر کہنے لگا "کہ اے راجہ ایسا گھر جو پاؤں تو بیٹھ یہاں پاتہ نہ جاؤں" یہ بات سن کر راجہ نے کچھ من میں سوچ نہ کیا۔ گنگا جل اور تلسی دل لے کر گھر اس برہمن کو سنکلپ کر دیا وہ گھر پا کر برہمن ایسا آنند ہوا جیسے چکور رات کو پاوے ہے۔

(سنگاسن بتیسی ص ۲۲)

للو لال نے بہاری لال کی ست سائی کی جو "لال چندریکا" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی ہی میں شرح بھی لکھی ہے۔ یہ تالیف بہت ہی کم مشہور رہی ہے[1]۔ للو لال نے اس کے علاوہ بھی متفرق طور پر نظم و نثر میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ مظہر علی خاں ولاؔ کی بیتال پچیسی میں بھی مدد دی دوسرے ہندی ترجموں میں انہوں نے جو کچھ حصہ لیا ہے۔ اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں متفرق طور پر کیا جا چکا ہے۔

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی از ایف۔ اے۔ کئی صد ۸۹ ۱۲

مرزا محمد فطرت

مرزا محمد فطرت لکھنؤ کے رہنے والے اور بہت ہی گمنام اہل قلم ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور فطرت تخلص کرتے تھے۔ شعرائے اُردو کے تذکروں میں صرف "طبقات الشعرائے ہند" مؤلفہ کریم الدین ہیں ان کا کچھ ذکر ملتا ہے مگر اس سے ان کے حالات و تصانیف پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ فطرت فورٹ ولیم کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح نہایت ادنیٰ درجہ کے شاعر بلکہ یوں کہئے کہ معمولی موزوں طبع تھے ان کے حالات پر گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ٹھیک طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے اور کب تک وہ اس سے متوسل رہے ان کا صرف ایک ہی کارنامہ مشہور اور ان کی یادگار ہے۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا مؤلفہ گریرسن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۰۱ء سے کچھ قبل جارج ہاڈلے کی قواعد اُردو کا ایک مرمہ ایڈیشن تیار کیا تھا کیونکہ یہ ایڈیشن ۱۸۰۱ء میں لندن سے شایع ہوا۔ جارج ہاڈلے نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان کے چند قواعد و اصول ضبط تحریر میں لاکر ایک کتاب لندن سے ۱۷۷۲ء میں شایع کی تھی۔ ہندوستان

کی زبان سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے انگریزوں کو اکثر ایسی کتابوں کی ضرورت رہی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب کئی بار چھپی اور ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا گیا۔

قواعد زبان کے علاوہ ہندوستان کی معاشرت اور رسم و رواج پر کچھ ناقص معلومات بھی اس کتاب سے حاصل ہو سکتی تھی۔ اس زمانہ میں ایسی چیزوں کے متعلق مستند کتابیں اور ذرائع معلومات بالکل مفقود تھے اس لیے یہی ناقص معلومات اور رطب اور یابس سے بھرے ہوئے بیانات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور ہندوستان آنے والے نوجوان انگریز ان کو بہترین رہنمائے سفر سمجھ کر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ فطرت نے ہاڈلے کی گرامر کا جو ایڈیشن مرتب کیا تھا وہ بھی کئی بار شایع ہوا اور اور نو وارد انگریزوں کے مطالعہ میں رہا۔

اہل یورپ نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی اپنے زیر اثر ہندوستانیوں کو دین مسیحی سے واقف کرنے کی کوشش شروع کی اور ممالک یورپ کی تجارتی کمپنیوں کے قیام کے ساتھ پادری ہندوستان میں اپنی مقدس مذہبی کتاب "انجیل" کی اشاعت کرنے لگے بائیبل کو اردو میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش غالباً ۱۷۴۵ء میں شروع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہوتے ہی بائبل کا اردو ترجمہ کرانے کی تجویز ہوئی اور مرزا محمد فطرت نے دل ہنٹر

کی مدد سے یہ ترجمہ مرتب کیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اصل یونانی سے ترجمہ ہوا ہے۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۵ء میں شایع ہوا تھا۔

فطرت کے ترجمہ کے بعد سرام پور کے پادریوں نے ہندی اور برج بھاشا میں بھی بائیبل کے دو تین ترجمے شایع کیے پھر ایک اور ترمیمہ ایڈیشن "برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی" کی جانب سے شایع کیا گیا۔ اس ایڈیشن کی ترتیب بھی مرزا فطرت نے پادری مارٹن کی مدد سے کی تھی۔ چونکہ اس کا ترجمہ اہم تھا۔ اس لیے کالج کے چند دیگر منشیوں سے بھی اس کی نظر ثانی کرائی گئی۔ اس ترمیمہ ایڈیشن کی اشاعت ۱۸۱۴ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے متعدد ایڈیشن فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں شایع ہوئے آجکل "عہد جدید" کے جو نسخے رائج ہیں بعض الفاظ اردو بدل ہو رہے ہیں۔ مگر ترتیب عبارت فطرت ہی کی ہے۔ فطرت نے صرف عہد جدید کا ترجمہ کیا تھا عہد عتیق کا کسی اور نے کیا ہے۔ فطرت کا طرز بیان سادہ اور زبان سنجیدہ ہے۔

میر محی الدین فیض

میر محی الدین فیضؔ کا حال کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ شعرائے دہلی کے مقامی تذکرے بھی ان کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ان کی ایک تالیف دیکھی ہے اس سے جو حالات معلوم ہوئے ان کو "فہرست کتب خانہ شاہان اودھ" میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام میر محی الدین اور فیضؔ تخلص تھا ان کے آباو اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے مگر گیارہ بارہ نسلوں سے ان کا خاندان دہلی میں سکونت پذیر تھا وہ اہل دہلی میں بہت مشہور تھے مگر تعجب ہے کہ دہلی کے کسی تذکرہ شعراء میں ان کا ذکر نہیں۔ میر محی الدین کی پیدائش اور تربیت بھی اسی شہر میں ہوئی دہلی کی تباہی کے بعد ان کا خاندان غازی پور کو منتقل ہوا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے تحصیل زبان اُردو کے لیے مختلف شہروں کے دورے کیے اور ہر شہر کے شعراء داد با اور عام ادبی ذوق رکھنے والوں سے میل جول پیدا کیا۔ دورۂ غازی پور میں فیضؔ سے ان کی ملاقات ہوئی وہ ان کی شعر گوئی اور ادبی ذوق سے متاثر ہوئے اور اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ

کے ایما سے فیضؔ نے ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۳ء میں حضرت شیخ فرید الدین عطار کے پند نامہ کا اردو ترجمہ کیا یہ ترجمہ منظوم ہے اور "چشمۂ فیض" کے نام سے موسوم ہے۔ کتب خانۂ شاہان اودھ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اس کی ابتداءً اس بیت سے ہوتی ہے ؎

شکر کر اے دل خدائے پاک کا ہے جو ایمان بخش مشت خاک کا

فیضؔ کا نہ تو کسی تذکرہ نویس نے تذکرہ کیا نہ ان کی یہ تالیف ہی کہیں دستیاب ہوئی۔ کتب خانۂ شاہان اودھ کے سوا کسی اور کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ بھی محفوظ نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب طبع بھی ہوئی یا نہیں ہمیں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

سیّد حمید الدین بہاری

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا تذکرہ نامکمل ہوگا اگر سید حمید الدین بہاری کا ذکر نہ کیا جائے اگرچہ ان کی تالیف بلحاظ ادبیات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر اس لحاظ سے کہ وہ بھی ان محرکین نثر اُردو کے زمرہ میں شامل ہیں ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کو ہندوستانی معاشرت، تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے عقاید، رسم و رواج سے عجیب دلبستگی تھی وہ اُردو کے نہ صرف خود دلدادہ تھے بلکہ اس کو عام کرنے اور اپنے ہم وطنوں کو سیکھانے کے خواہاں بھی تھے۔ اس معاملہ میں وہ مذہبی تعصب یا اجنبیت کا خیال کیے بغیر اہل یورپ کو ان سے واقف کرانے کے متمنی تھے۔ ان کی یہ اسپرٹ یقیناً ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنے اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ حسن سلوک پر آمادہ کرنے والی تھی۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان اور اسلامی اخلاقیات، قصص و حکایات اور تاریخ و تذکرہ کی کتابیں ترجمہ کرا کر اہل یورپ کو اسلامی

اخلاق و خیالات سے واقف کر دیا۔ بلکہ ان کی مقدس کتاب قرآن مجید کا اُردو ترجمہ کرا کر مسلمانوں کے اصلی عقائد سے بھی آشنا کرنا چاہا۔ اسی اسپرٹ کے ماتحت انھوں نے سید حمید الدین بہاری سے ہندوستانی کھانوں کی کتاب "خوان الوان" مرتب کرائی۔

سید حمید الدین کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل نہ ہو سکی صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوبہ بہار کے باشندے تھے نہ تو وہ شاعر معلوم ہوتے ہیں نہ پڑ نویس نثر نگار۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں ملازم تھے یا نہیں ان کی تالیف "خوان الوان" کا ایک نسخہ قلمی برٹش میوزیم میں ہے مسٹر بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایماء سے لکھی گئی ہے اور دیباچہ میں اس کا ذکر موجود ہے اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں یا اس کے قبل لکھی گئی کیونکہ اسی سال ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس ہو گئے۔

فارسی میں طعام خانہ اور رکھوان کے متعلق کئی ایک کتابیں موجود ہیں ہمیں "خوانِ الوان" کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حمید الدین کی تصنیف ہے یا کسی فارسی کتاب کا ترجمہ برٹش میوزیم کا نسخہ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈھائی سو

صفحات اور (۴۲) ابواب پر مشتمل ہے مضمون کتاب کی مناسبت
سے باب کی جگہ خوان کا عنوان رکھا گیا ہے اس وقت کے تمام
مروجہ کھانوں اور مٹھائیوں کا تفصیلی بیان ہے ہر ایک کھانے
کے اجزا اور اس کے پکانے کے طریقے وضاحت سے بیان
کیے گئے ہیں آخری باب میں مصطلحات طعام خانہ کی ایک فرہنگ
ہے اور اس میں تمام الفاظ متعلقہ کی ترتیب حروف تہجی پر نہیں
بلکہ ابواب کے موافق ہے غالباً سید حمید الدین کا یہی ایک کارنامہ
ہے اور انھوں نے اس کے سوا کوئی اور تالیف یا ترجمہ نہیں
کیا۔

نظرِ بازگشت

صفحاتِ گزشتہ میں فورٹ ولیم کالج کے اربابِ قلم کے حالات ان کی تصانیف وتراجم وغیرہ پر خود ان کی تالیفات اور دیگر ذرایع سے جو معلومات دستیاب ہوئی پیش کی گئی ہے۔ ذیل میں بہ حیثیت مجموعی اس کالج کی اردو نوازی اور اردو نثر نویسی کی اساسی تحریک کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے۔

گذشتہ صفحات کے مطالعہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس کے ذریعہ اردو نثر نویسی کی تحریک کا اصل مقصد ان نووارد انگریزوں کو ہندوستانیوں سے واقف اور ان کے طور طریقوں سے آشنا کر کے ہندوستان میں حکمرانی کے قابل بنانا تھا جو انگلستان سے کمپنی کی ملازمت میں داخل ہو کر یہاں آتے تھے اس کالج کی بنیاد اہلِ ہند کے فائدہ پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ صرف کمپنی کی ضروریات کی تکمیل نے اس کو بالواسطہ اردو لٹریچر کے لیے ممد ومعاون بنا دیا۔

اس کالج کے روح رواں ڈاکٹر گل کرسٹ تھے انہوں نے خود بھی جو کتابیں لکھیں اور اپنی سرپرستی واعانت سے اردو کی جو

شاندار خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر اپنے اپنے موقع پر تفصیل سے آچکا ہے نیز اس کالج سے پہلے اردو نثری ادب کی کیا حالت تھی اس پر بھی ابتداءً کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اس کالج کی بانی اور سرپرست ایک ایسی قوم تھی جو خود بھی اپنا بہترین لٹریچر رکھتی ہے ممکن تھا کہ وہ اردو میں اپنے لٹریچر کو منتقل کرنے کی کوشش کرتی مگر اس راہ میں اتنی مشکلات کا سامنا تھا کہ اس مہم کا سر کرنا امر محال نظر آتا ہے اہل ہند میں جو لوگ تصنیف و تالیف کی صلاحیت رکھتے تھے وہ انگریزی اور مغربی علوم سے قطعًا نا آشنا تھے اور انگریزی زبان سے علم و فن کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا ہرگز ان سے بن نہیں سکتا تھا علاوہ ازیں کالج کے قیام اور اس کی فوری ضروریات نے اس کا بھی بہت ہی کم موقع دیا کہ خود اردو میں مستقل کتابیں لکھائی جائیں ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ فارسی اور ہندی کی ایسی مقبول عام اور ٹھیٹ کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر لیا جائے جن سے ایک طرف تو خود اہل ہند دلچسپی لیتے ہیں اور دوسری طرف اہل ہند کے مذاق و خیالات کے سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکے اس طرح نثر نویسی کی تحریک انگریزوں کی سرپرستی میں شروع ہوئی اگرچہ انگریزی کا اس پر بہت ہی خفیف اثر پڑا لیکن اردو زبان پر انگریزی اثر کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔

علوم و فنون کی کتابوں کو غیر زبانوں سے اپنی زبان میں منتقل

کرنے کا طریقہ ہر قوم میں رائج رہا ہے ایک قوم میں ترقی علم وفن کی پہلی منزل یہی ہے۔ یہ وہ قدم گاہ ہے جس پر چڑھے بغیر کوئی قوم علم و فن میں معراج کمال کو نہیں پہنچی۔ اہل عرب نے پہلے یونانیوں سے علوم وفنون اپنی زبان میں منتقل کیے اور پھر خود ایسے صاحب کمال بن گئے کہ دوسری اقوام نے ان کی تحقیقات اور معلومات کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اہل یورپ اور بالخصوص اہل انگلستان جو آج دنیا بھر کے علوم وفنوں کے خزانوں کے مالک ہیں وہ بھی اس راہ سے گذر چکے ہیں۔ انہوں نے ابتداءً عربوں اور دیگر ترقی یافتہ قوموں کی تصانیف کا ترجمہ اپنی زبانوں میں کر لیا۔ پھر ان کے ذریعہ "دماغی آزادی" حاصل کر کے خود صاحب تصانیف بن گئے۔ غیر زبان کے ذخیرہ علم وادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا شوق اس درجہ ترقی کر گیا ہے۔ کہ اب تو یورپ کی ہر قوم مشرق اور بالخصوص ایرانیوں اور عربوں کی شاعری کو جس کا ترجمہ ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے اپنی زبان میں منتقل کرنے کی ساعی ہے ان کی زبانوں میں دیوان حافظ، مثنوی مولانائے روم رباعیات عمر خیام، وغیرہ کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اور اب بھی یہ کام اسی شوق و ذوق سے جاری ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

اردو زبان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اس میں بھی یہ طریقہ درج رہا ہے دکن کے قدیم شعراء و مصنفین نے فارسی نظم ونثر کی کتابوں

کے ترجمہ کی ابتدا کی اور اپنے محدود دائرہ میں ان کا جو کچھ بھی کارنامہ ہے اس کی پہلی منزل بھی ترجمہ ہی کی ہے۔ شمالی ہند اور عام اردو دنیا میں بھی لٹریچر کی پیداوار اسی عام سمت پر ہوئی فورٹ ولیم کالج کے بعد اکثر مصنفین نے بطور خود اور علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی، دیگر ملکی اور علمی انجمنوں اور جامعہ عثمانیہ نے اجتماعی طور پر یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ آج اردو کی دنیا میں جو اہل قلم مستقل تصانیف کے مالک ہیں وہ سب اسی خرمن کے خوشہ چین اور اسی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں اور اردو میں مستقل کتابیں لکھنے کا جو کچھ چرچا ہے اس کی بنیاد اسی ترجمہ کی منزل میں ملتی ہے۔ اس خصوص میں فورٹ ولیم کالج کو اولیت کا نہیں تو اساسی محرک ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے دکن میں ترجمہ کے ذریعہ اردو نثری ادب کی پیداوار کی تحریک ایسی سرسبز اور عام نہیں ہوئی جیسی کہ اس کالج کے ذریعہ ہو گئی۔ اس کے بعد ہی ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط بھی بالواسطہ اس تحریک کو عام کرنے کا باعث ہوا اور اردو لٹریچر میں بہت جلد کتب نثر کا کافی ذخیرہ پیدا ہو گیا۔

شمالی ہند کے مصنفین میں کسی نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی تحریک سے قبل بطور خود نثر نویسی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ وہ اردو

زبان میں ماہر اور محاورہ روزمرہ کے دھنی تھے ان میں نثر نویسی کی صلاحیت موجود بھی تھی صرف مناسب رہنمائی کی ضرورت تھی۔ یہ رہنمائی ڈاکٹر گل کرسٹ نے کی اور بہت جلد ان کو نثر نویسی میں ممتاز حیثیت دلادی۔ اگرچہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی مساعی کا دائرہ عمل صرف کالج کے ارباب قلم تک محدود تھا اور انہوں نے عام طور پر نثر نویسی کی وسیع رہنمائی اور سرپرستی نہیں کی مگر ان کی تحریک ایسے مناسب موقع پر شروع ہوئی تھی کہ اس کو بہت ہی قلیل عرصہ میں رواجِ عام حاصل ہوگیا سلطنتِ مغلیہ کے اقتدار میں زوال آگیا تھا سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی فارسی کی وہ منزلت باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے زمانۂ عروج واقبال میں تھی ہندوستان کی دوسری قومیں اب فارسی کی طرف اس شوق رغبت سے متوجہ نہیں رہی تھیں جیسا کہ اکبر اور شاہ جہاں کے زمانہ میں تھیں۔

بظاہر فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں کوئی اعلیٰ علمی تصنیف یا تالیف نظر نہیں آتی زیادہ تر کتابیں قصص وحکایات کی ہیں اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دور کی نثری پیداوار افسانوی ہے۔ مگر یہ حقیقت سے دور ہے اوّل تو نظمائے کمپنی نے یہ کالج جن شروط وقیود سے قایم کیا تھا اس کی وجہ سے اس کا دائرہ نہایت تنگ ہوگیا تھا۔ لارڈ ویلزلی اور گل کرسٹ

تو اس کو حقیقت میں ایک اردو یونیورسٹی بنانے کے خواہشمند تھے
انہوں نے مشرقی و مغربی السنہ کے علاوہ اعلیٰ علوم مثلاً ریاضی تاریخ
جغرافیہ، معاشیات وغیرہ کے شعبے قایم کرنے کی کوشش کی مگر ایسٹ انڈیا
کمپنی نے ان کی ایک نہ سنی اور صرف ملکی زبانوں کی ایک تعلیم گاہ
قایم کرنے کی اجازت دی اس کے علاوہ اس زمانے میں عام
ہندوستانیوں کا علمی مذاق کسی قدر بگڑ چکا تھا تاریخ سے بہ
حیثیت فنِ تاریخ نہیں بلکہ بہ لحاظِ قصہ دلچسپی باقی تھی۔ عام طور
پر قصص و حکایات اور وہ بھی فوق العادت اور فوق الفطرت
قصے پسند کیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں فارسی کا بھی سب سے
زیادہ مقبول لٹریچر انہی قصہ کہانیوں کی کتابوں پر مشتمل تھا اخلاقیات
اور فکر و نظر پر مستقل اور ٹھیٹ علمی کتابوں سے عوام کو کسی طرح
کی دل چسپی نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے قدما نے ان بلند مضامین کو
ہمیشہ قصہ کہانی کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ مشرق کے افسانوی ادب
میں اخلاقی عنصر ہی سب سے زیادہ ہے اور اکثر صورتوں میں
قصے کی تان کسی نہ کسی نصیحت اور عبرت کی بات پر ٹوٹتی ہے خاص
و عام قصہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب پڑھتے ہیں تو
خود بخود اس کی اخلاقی تعلیم سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کے ماحول ان کے رسم و رواج اور طور
طریقوں کے معلوم کرنے کے لیے ان کا ایسا ہی لٹریچر مطالعہ کرنا

ضروری خیال کیا گیا یہی کتابیں ان کے فکر و ذکر کی آئینہ تھیں۔ یہ سچ ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے جو کتابیں اُردو میں ترجمہ کرائیں ان میں زیادہ تعداد ان ہی کتابوں کی ہے مگر اس کی مساعی کا دائرہ اس قدر تنگ داماں نہیں ہے تاریخ و تذکرہ کا بھی ایک معقول حصہ اس کالج کی طرف سے مرتب ہوا ہے۔ شیر علی افسوس کی آرایش محفل، حیدری کی تاریخ نادری، مظہر علی خاں ولا کی تاریخ شیر شاہی اور حسینی کی تاریخ آسام نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔ مرزا علی لطف کے تذکرۂ گلشن ہند اور یہاں کے دیگر تذکروں میں شعرائے اُردو کے قدیم تذکروں کی بہ نسبت واقعات و حالات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے بعض خالص علمی اور مذہبی کتابیں مثلاً اخلاق جلالی، ہدایت الاسلام، تنبیہ الغافلین وغیرہ بھی ان مولفین کی یادگار ہیں۔ قواعد زبان اور صرف و نحو اس زمانہ میں زیادہ تر انگریزی رسالے لکھے گیے ان کے مصنفین خود اہل یورپ تھے جو اپنی زبان میں اپنے ہم قوموں کو اُردو صرف و نحو کے اصول آسانی سے سکھا سکتے تھے تاہم کالج کے مصنفوں نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ بہادر علی حسینی کا خلاصہ قواعد گل کرسٹ اور مولوی امانت اللہ کی "صرف اُردو" وغیرہ ابتدائی رسالے ان کی قابل قدر کوششیں ہیں۔

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اس عہد میں پبلک کا عام مذاق علمی کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ علم و فن سے کوئی خاص رغبت نہ تھی

عام خاص لوگ قصص وحکایات کے دلدادہ تھے اس عہد کی قصہ پسندی نے ان مولفین کے ٹھوس علمی ثمرات کو بارور ہونے نہ دیا۔ اور ان کے کارناموں میں قصہ کہانیوں ہی کی زیادہ قدر کی گئی۔ کالج کی مطبوعات میں سب سے زیادہ مقبول کتابیں قصے کہانیوں کی ہیں ان میں سے اکثر کے اس وقت تک پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ خالص علمی اور تاریخی کتابوں کو بہت ہی کم مرتبہ اشاعت نصیب ہوئی بعض تو صرف ایک مرتبہ چھپ کر رہ گیئں اور بعض کے صرف قلمی نسخے رہ گئے جو اہل یورپ ہی کی علم دوستی سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یا ہندوستان کے غیر معروف کتب خانوں اور لوگوں کے خانگی ذخیروں میں ملتے ہیں۔

اس کالج کی اصلی سرگرمی کا زمانہ ڈاکٹر گلکرسٹ کا عہد صدارت تھا اس دور میں جو فورٹ ولیم کا دور اول قرار دیا جا سکتا ہے نہایت گراں قدر کتابیں ترجمہ ہوئیں ان کے انگلستان چلے جانے کے بعد ان کے جانشینوں نے اسی سرگرمی اور جوش سے زبان اردو کی خدمت نہیں کی جس کی وجہ سے ان کا لگایا ہوا پودا روز بروز ٹھٹھرنے لگا۔ اس کو پورے طور پر پھلنے پھولنے اور بہترین ثمرات دینے کے مواقع نہیں ملے۔ اس تحریک کے بعد اور سر سید احمد خاں کی مساعی شروع ہونے سے قبل جو کتابیں تصنیف و تالیف

ہوئیں ان میں زیادہ تر قصے اور ان سے کچھ کم مذہبی رسائل ہیں خالص علمی عنوانات پر کوئی گراں قدر تالیفات نہیں ہوئیں۔

اُردو میں مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا عام شوق بھی بالواسطہ اس کالج کی تحریک کا رہین منت ہے۔ کالج کی طرف سے قرآن مجید اور انجیل دونوں کے ترجموں کی کوشش ہوئی اہل یورپ اُردو زبان کی تکمیل کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی معتقدات و خیالات سے واقف ہونے لگے اور عیسائی مبلغین نے اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کے لئے زیادہ تر اسی زبان کو اختیار کیا۔ اسلام پر ان کے حملوں اور اعتراضوں کے جواب میں مسلمانوں کو بھی یہی زبان اختیار کرنی پڑی خود مسلمانوں کے آپس میں مقلد اور غیر مقلد کے مناظرے اسی زبان میں ہونے لگے اسی طرح مناظرات کا ایک اچھا خاصا ادب مرتب ہو گیا۔ گو فورٹ ولیم کالج نے اُردو زبان کی سرپرستی نے دونوں مذاہب کے مناظرین کو اسی زبان کی طرف مائل کر دیا۔

اس کالج کی کتابیں اُردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں انہوں نے صفائی و سادگی کی مشترکہ خصوصیت کے ساتھ آئندہ مصنفین کے آگے مختلف اسالیب بیان کے دروازے کھول دیے اس سے قبل کی اُردو کی جو متفرق تحریرات موجود ہیں ان کا طرز بیان قدامت اور کہنگی سے قطع نظر نہایت مغلق اور پیچیدہ ہے۔ شمالی ہند کی ابتدائی نثر نویسی کے نمونے بالکل فارسی کی مرصع اور مقفیٰ طرز پر مبنی ہیں ان میں سے

بعض نوا ایسے ہیں کہ انھیں بہ مشکل اُردو عبارت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فعل اور حروف ربط وغیرہ چند الفاظ سے قطع نظر کر لی جائے تو ساری عبارت فارسی رہ جائے گی۔ اس تحریک سے قبل درحقیقت اُردو کا اپنا کوئی مستقل اسلوب ہی نہیں تھا۔ جو کچھ لکھا گیا وہ محض فارسی کی بھونڈی تقلید تھی اس کالج کے ارباب قلم نے انگریزی عالمین کے ماتحت کام کیا تھا اور ان کی تصنیف کی سب سے بڑی غایت نووارد انگریزوں کو اُردو سکھانی تھی اس لیے انہوں نے سادگی وصفائی کا خاص طور پر لحاظ رکھا اس کالج کے تقریباً تمام مصنفین ایک دو مقفیٰ مثالوں کے سوا سادہ نثر نویسی کے علم بردار ہیں۔ سادگی کی مشترکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایسے گونا گوں دلآویز اسالیب پیش کرتے ہیں جن پر اُردو کے تمام اسالیب بیان کی بنیاد ہے اگر ایک طرف میر امّن اور شیر علی افسوس دہلی کے روزمرہ اور محاوروں پر اپنی کتابوں کی بنیاد رکھتے ہیں تو دوسری طرف مولوی اکرام علی حیدر بخش حیدری وغیرہ کی زبان سنجیدہ اور علمی ہونے کے علاوہ مقامی اثرات سے پاک ہے اگرچہ ان کی کتابوں کو تالیف ہوئے سو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا مگر اب بھی ان میں بہت سی کتابیں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں زبان کے کافی ارتقا اور تغیر و تبدل کے بعد بھی ان کی زبان فرسودہ اور دور از کار نہیں بنی اس نے اپنی دلآویزی سے فارسیت کے عالمگیر اثر کے باوجود سلیم الطبع اہل قلم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ابھی تک اردو نثر نویسوں کے اکثر کارنامے تاریکی میں ہیں اور غدر سے قبل کے نثر نویسوں میں بہت ہی کم مشہور ہیں اس وجہ سے قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ مصنفین فورٹ ولیم کالج کے اسالیب بیان نے ان پر کیا اثر ڈالا اور اس دور کے کون کون مصنفین ان اسالیب کے پیرو ہیں۔ موجودہ معلومات اس بارہ میں نہایت ناکافی ہے اس سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ عوام الناس میں ان اسالیب کو بے حد پسندیدگی حاصل ہو گئی تھی دہلی اور اہل لکھنؤ میں کم۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مصنفین پر فارسیت کا رنگ بہت زیادہ چھایا ہوا تھا اور بالخصوص مسلمان اس اثر کو دور کرنا پسند نہیں کرتے تھے انہیں سادہ نگاری اختیار کرتے میں پس و پیش ہوتا تھا خود سر سید احمد خاں جو فطرتاً سادہ نگاری کی طرف مائل تھے اپنی کتاب "آثار الصنادید" کے پہلے اڈیشن کے وقت اس کو ایک مرصع نگار سے درست کرواتے ہیں کیونکہ اپنے سادہ طرز بیان میں اس کتاب کے مقبول عام نہ ہونے کا اندیشہ تھا تاہم ان اسالیب بیان نے سلامتی پسند طبائع پر نہایت اچھا اثر کیا۔ مرزا غالب کے خطوط اور ان کے معاصرین کی سادہ نثر نویسی بھی ان سے متاثر نظر آتی ہے غالباً خطوط کی مقبولیت کے اسباب میں غالبؔ کی طرز تحریر کی خصوصیات شوخی و ظرافت وغیرہ کے علاوہ سلیم الطبع افراد میں سادہ عبارتوں کی پسندیدگی بھی ہے میر امنؔ۔ حیدر بخش حیدری اور ان کے ہم کاروں کے اسالیب کی پختہ کاری نے اگر اچھے مابعد قریب

کے زمانہ پر نہیں تو لعید پہ زیادہ پائدار اثر ڈالا۔ اُردو کے کئی متاخر مصنفوں کے اسالیب کی بنیاد انہی کے اسلوبوں پر نظر آتی ہے۔

اس کالج کی تحریک سے نہ صرف اُردو کا نثری لٹریچر پیدا ہوا بلکہ اس کی عام اشاعت کے بھی کامیاب ذرایع مہیا ہو گئے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے ...... پہلے طباعت کا انتظام ہی نہیں تھا۔ اس عہد میں چند پتھر کے چھاپہ خانے قایم ہوئے کلکتہ میں کالج نے سب سے پہلے ٹائپ پریس قایم کیا اور اس کے مصنفین کی کتابیں اس مطبع میں چھپنے لگیں۔ طباعت کی سہولت نے بہت ہی قلیل عرصہ میں ان کتابوں کو سارے ہندوستان میں شایع کر دیا اور خاص و عام ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ ہماری ضروریات بہت زیادہ ہو گئی ہیں لیتھو کی چھپائی سے عام طور پر بیزاری ظاہر کی جا رہی ہے اور ہر شخص ٹائپ پریس کے رواج کا خواہشمند ہے دارالطبع حیدرآباد نے بڑی کوشش سے اُردو ٹائپ بنایا ہے اور سرکار عالی کا "جریدۂ اعلامیہ" بھی ٹائپ کے حروف میں شایع ہونے لگا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا ٹائپ پریس اس پر ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگرچہ دارالطبع کے تیار کردہ حروف اس زمانہ کے حروف سے کسی قدر سڈول اور خوشنما ہیں لیکن اس سے کچھ زیادہ شاندار ترقی اس باب میں حاصل نہیں ہوئی وہ ٹائپ بھی اپنی جگہ نہایت اچھا تھا اگرچہ اس میں نستعلیق خط کی خوبصورتی ہرگز نہیں پائی جاتی لیکن اگر اس وقت سے برابر ترقی دی جاتی تو اس وقت تک یقیناً نہایت

خوشنما ٹائپ تیار ہو جانا۔

فورٹ ولیم کالج نے اُردو شاعری کی براہِ راست کوئی خدمت نہیں کی ، اس کی بدولت اُردو شاعری میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جیسی کہ کرنل ہال رائڈ اور پنجاب بک ڈپو کے ذریعہ لاہور میں عمل میں آئی۔ اس کا واحد شاندار کارنامہ نثر اُردو کی خدمت ہے تاہم اس سے اُردو شاعری کو بھی متمتع ہونے کا موقعہ ملا۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفین شعر گوئی کا چسکا رکھتے تھے مگر اس میں ان کو کوئی ممتاز درجہ حاصل نہیں ایک دو بلند پایہ شاعروں سے قطع نظر تقریباً تمام مصنف معمولی درجہ کے ناظم تھے ان کے نظمیہ کارنامے کسی قدر و منزلت کے مستحق نہیں۔ اس کے باوجود بھی کالج نے ان کی سرپرستی کی اور ان کے شاعرانہ کمال کو استحقاق سے زیادہ وقعت دی۔ ان کے شاعرانہ ذوق کی تکمیل کے لیے کالج کی جانب سے ہر سال عظیم الشان پیمانہ پر ایک مشاعرہ کیا جاتا تھا اور اچھے شاعروں کا کلام گراں قدر انعام دے کر خرید لیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے ان کی نظموں کی اشاعت بھی کی گئی اس کے علاوہ اس خصوص میں فورٹ ولیم کالج کی نمایاں اور قابل تعریف خدمت شعرائے اُردو کے دیوانوں کے پاکیزہ انتخابات شائع کرنا ہے میر تقی مرزا سودا اور میر سوز وغیرہ اساتذہ اُردو کے کلام کے جامع انتخابات کالج کے خوش مذاق مصنفین سے کرائے گئے اور انہیں صحت و اہتمام کے ساتھ شایع کیا گیا۔ ان انتخابات سے جو ہماری نظر سے گذرے ہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شاعر کے کلام کی اصلی ردح بے لی

گئی ہے اور رطب و یابس کو خارج کر دیا گیا ہے۔ ادبیات عالیہ سے مطالعہ میں انتخابات نہایت ضروری ہیں ہر شاعر کا کلام ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک ہی معیار کا اور قابل مطالعہ نہیں ہوتا کسی زبان کی شاعری کا سارا ذخیرہ سب کا سب مطالعہ کا مستحق نہیں اور نہ کوئی اس کا کامل مطالعہ کر سکتا ہے۔ خوش سلیقہ انتخاب ہی ایسا واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ بے جا وقت ضایع کیے بغیر شعراء کا بہترین کلام عام مطالعہ میں آجاتا ہے اور شاعر کی ذہنیت، پیام، خیالات، زبان، خصوصیات ہر ایک چیز اس سے معلوم ہو جاتی ہے اُردو شاعری میں سے ایسی کار آمد باتوں کو نکال لینے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ نولکشور پریس کی بدولت بہت سے اُردو شاعروں کے ضخیم دیوان تو چھپ کر شایع ہو چکے ہیں مگر کوئی ان کے مطالعہ سے معقول استفادہ نہیں کر سکتا۔ اشعار کی بڑی تعداد غلط ہے پھر ہر قسم کا کلام ہے جس کا مطالعہ "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" کا مصداق ہے اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے بعد بھی انتخابات کی اشاعت میں کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کی گئی ہے اور اس وقت شعرائے اُردو کے انتخابات کا تھوڑا سا ذخیرہ موجود ہے لیکن انتخابات معیاری نہیں اکثر صورتوں میں وہی رطب و یابس کی بھرمار ہے اور انتخابات کا اصل منشا پورا نہیں ہوتا۔

اس کالج نے ہندی زبان کی بھی معقول سرپرستی کی ہے موجودہ اعلیٰ یا معیاری ہندی کی بنیاد اسی کی سرپرستی میں رکھی گئی ہے کالج کے

ہندی مصنف جن میں للولال کوی سب سے زیادہ ممتاز ہیں موجودہ معیاری ہندی کے بانی ہیں۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے نہ صرف فارسی بلکہ ہندی کی بھی مقبول اور مشہور کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا۔ اور حقیقی علمی فیاضی سے کام لے کر اردو کو کافی وسیع کر دیا ہے ہندی کی زبان کے ساتھ ان کی سرپرستی ایسی وسیع نہیں رہی جیسی کہ اردو کے ساتھ رہی ہے لیکن یہ کسی تنگ نظری کا نتیجہ نہیں اس زمانہ میں ہندی زبان بلحاظ علم و ادب کچھ بھی نہیں تھی اس کی مختلف شاخیں مشرقی ہندی، مغربی ہندی، راجستانی، بہاری وغیرہ ہیں پھر ان کی اور شاخیں اور بولیاں ہیں جن میں سارا ہندی لٹریچر منتشر ہے کوئی ایک شاخ شاعری اور اصناف ادب کے لحاظ سے ایسی وقیع و وسیع نہیں تھی کہ اس کی سرپرستی کر کے اس کا ذخیرۂ کتب بڑھایا جاتا ہندی لٹریچر کا عہد زرین مغلیہ تسلط کا زمانہ اور بالخصوص اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا عہد حکومت ہے۔ مگر اس دور میں زیادہ تر اردو شاعری پائی جاتی ہے علم و ادب کی اعلیٰ چیزیں بالکل مفقود تھیں اس دور کے بعد اگر کچھ حقیقی اضافہ ہوا تو اس کالج کی سرپرستی سے۔ متاخرین اور حالیہ ہندی مصنفین کی ساری علمی مساعی کی بنیاد اسی کالج کی سرپرستی میں پڑی اور اس کی ساری موجودہ ترقیوں کا نقطۂ آغاز یہیں ملتا ہے۔

اشاریہ

فورٹ ولیم کالج کے مؤلفین اور ان کی تالیفات

۱۔ میر امن دہلوی :۱۔ باغ و بہار ۔ ۲۔ گنج خوبی ۔

۲۔ سید حیدر بخش حیدری :۔ ۱۔ قصہ مہر و ماہ ۲۔ قصہ لیلیٰ مجنوں ۔ ۳۔ طوطا کہانی ۔ ۴۔ آرائشِ محفل ۔ ۵۔ ہفت پیکر ۶۔ تاریخ نادری ۔ ۷۔ گل مغفرت ۔ ۸۔ گلزار دانش ۔ ۹۔ گلدستۂ حیدری ۔ ۱۰۔ تذکرہ گلشن ہند ۔

۳۔ میر شیر علی افسوس دہلوی :۔ ۱۔ دیوانِ افسوس ۲۔ باغ اُردو ۳۔ آرائش محفل ۔

۴۔ میر بہادر علی حسینی :۔ ۱۔ نثر بے نظیر ۔ ۲۔ اخلاق ہندی ۔ ۳۔ تاریخ آسام ۔ ۴۔ رسالہ گل کرسٹ ۔

۵۔ مرزا علی لطف :۔ ۱۔ کلیاتِ لطف ۔ ۲۔ تذکرہ گلشن ہند ۔

۶۔ مولوی امانت اللہ :۔ ۱۔ ہدایت الاسلام عربی ۔ ۲۔ ہدایت الاسلام اُردو ۔ ۳۔ ترجمۂ قرآن مجید ۔ ۴۔ جامع الاخلاق ۔ ۵۔ صرف اُردو ۔

۷۔ مظہر علی خاں ولا:۔ ۱۔ مادھونل اور کام کندلا ۔ ۲۔ ترجمۂ کریما ۳۔ ہفت گلشن ۔ ۴۔ اتالیق ہندی ۔ ۵۔ بیتال پچیسی ۔ ۶۔ تاریخ شیر شاہی ۔ ۷۔ جہانگیر نامہ ۔

۸۔ مرزا جان طپش:۔ ۱۔ کلیات طپش ۔ ۲۔ شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان ۔ ۳۔ بہار دانش ۔ ۴۔ یوسف زلیخا ۔

۹۔ مرزا کاظم علی جوان:۔ ۱۔ سکنتلا ناٹک ۔ ۲۔ بارہ ماسہ ۔ ۳۔ تاریخ فرشتہ

۱۰۔ شیخ حفیظ الدین احمد:۔ ۱۔ خرد افروز

۱۱۔ خلیل علی خاں اشک:۔ ۱۔ قصہ امیر حمزہ ۔ ۲۔ واقعات اکبر ۔ ۳۔ قصہ گلزار چین ۔ ۴۔ رسالہ کائنات ۔

۱۲۔ مولوی اکرام علی:۔ ۱۔ اخوان الصفا

۱۳۔ نہال چند لاہوری:۔ ۱۔ مذہب عشق

۱۴۔ بینی نارائن جہاں:۔ ۱۔ چار گلشن ۔ ۲۔ دیوان جہاں ۔ ۳۔ تنبیہ الغافلین

۱۵۔ میر عبداللہ مسکین:۔ ۱۔ مرثیہ ہائے مسکین

۱۶۔ للولال کوی:۔ ۱۔ پریم ساگر ۔ ۲۔ راج نیتی ۔ ۳۔ سبھا بلاس ۔ ۴۔ مادھو بلاس ۔ لطائف ہندی ۔ ۶۔ سنگھاسن بتیسی

۱۷۔ مرزا محمد فطرت:۔ ۱۔ عہد نامہ جدید (انجیل)

۱۸۔ محی الدین فیض:۔ ۱۔ چشمۂ فیض ۔

۱۹۔ سید حمید الدین بہاری:۔ ۱۔ اخوان الصفا ۔

(کتابت زاہد خاں)

فہرست

ہماری مطبوعات

نام	[redacted]	مصنف
بانگ درا مع شرح	[redacted]	یوسف سلیم چشتی
ارمغان حجاز مع شرح	[redacted]	یوسف سلیم چشتی
رموز بے خودی مع شرح	[redacted]	〃
جاوید نامہ مع شرح حصہ اوّل	[redacted]	〃
〃 〃 حصہ دوم	[redacted]	〃
شرح بال جبریل	[redacted]	〃
شرح ضرب کلیم	[redacted]	〃
شرح دیوان غالب	[redacted]	〃
شرح دیوان حالی، مرتبہ مجیب [redacted]	[redacted]	
تعلیمات اقبال	[redacted]	سلیم چشتی
اعراف اقبال	[redacted]	ملک حسن اختر
اقبال اور عبدالحق	[redacted]	ممتاز حسن
یاد اقبال	[redacted]	ڈاکٹر عبدالمجید
مومن اور مطالعہ مومن	[redacted]	عبادت بریلوی
مقدمات عبدالحق	[redacted]	〃
تنقیدی نقوش	[redacted]	ڈاکٹر عبدالقیوم

نام	[redacted]	مصنف
اُردو میں ڈرامہ نگاری	[redacted]	بادشاہ حسین
میرے بہترین افسانے	[redacted]	پریم چند
زادِ راہ	[redacted]	پریم چند
نرملا	[redacted]	״
بت تراش	[redacted]	یاقوتہ رحمٰن
شمع	[redacted]	اے آر خاتون
دشمن دامن	[redacted]	سلمیٰ کنول
صلیبیں میرے دریچے میں	[redacted]	فیض احمد فیض

[redacted]

ہماری نئی آنے [redacted]لی کتب

مثنوی پس چہ باید کرد مع شر [redacted]		
ہر دو حصّہ	[redacted]	سلیم چشتی
پیام مشرق مع شرح	[redacted]	״
مطالعات اقبال	[redacted]	״
اردو میں فن سوانح	[redacted]	
نگاری کا ارتقاء	[redacted]	الطاف فاطمہ

. . . . [redacted] . . . .

کتبہ: زاہد خاں [redacted]